مشعل

پشاور

ایڈیٹر

مفتی عزیز الرحمٰن بی۔ اے

جلد ۱	یکم جولائی ۱۹۳۷ء	نمبر ۱

مضامین

مشعل

جن لوگوں کو تعلیم کے کام سے کسی قسم کا تعلق ہے۔ خواہ وہ ملک کے مدارس میں معلم ہوں۔ خواہ منتظمین یا معائنہ کنندگان ہوں یا طلباء کے سرپرستوں کی صف میں شامل ہوں۔ سب کے سب جہاں تعلیم کی اہمیت اور اس کے فیض کے قائل ہیں وہاں یہ بھی مانتے ہیں۔ کہ تعلیم سے پورا فائدہ صرف اسی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تعلیم نہایت ہی اعلےٰ اور مستند طریقوں پر دی جاوے۔ لیکن تعلیم کی رفتارِ توسیع کے مطابق تربیت یافتہ مدرسین اور فرض شناس آزمودہ کار معلمین کا بہم پہنچانا کوئی سہل کام نہیں۔ اور بغیر اس کے حصولِ مقصد نہایت مشکل ہے۔ اس غرض کے حصول کے لئے گورنمنٹ کا ٹریننگ سکول قائم کر دینا ہی کافی نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تربیت گاہوں کے کام کو بہتر بنانے کے لئے داخلہ کے وقت انتخاب کرنا۔ صرف آزمودہ امیدواروں کو داخل کرنا۔ نصاب کو بروقت درست کرتے رہنا۔ مدت تربیت کا ایزاد کرنا۔ اور دیگر مختلف تجاویز پر عمل پیرا ہونا یقیناً اصلاح اور ترقی پیدا کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔ اور کام کو روز بروز بہتر بنا رہے ہیں۔ لیکن مدرسین۔ ممتحنین اور والدین کا باہمی مشورہ اور تبادلہ خیالات اس کام کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ اس مدعا کو پورا کرنے کے لئے مختلف ملکوں اور ان کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں



تعلیمی مجلے جاری کئے گئے ہیں۔ لیکن صوبہ ہذا میں اگرچہ چند ادبی رسالے۔ صبح امید۔ خیبر میگزین۔ طور۔ سفیر سخن۔ وغیرہ وغیرہ جاری ہوئے ہیں۔ لیکن تعلیمی رسالے کی ضرورت مدت سے محسوس ہوتی چلی آرہی تھی۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گورنمنٹ ٹریننگ سکول کے سٹاف نے جہاں مدرسین کی تربیت کا معیار اس قدر بلند کر دکھایا ہے۔ کہ اس سال کے جے وی امتحان کا نتیجہ سو فیصدی ہونے کے علاوہ ۹۰ طلباء میں سے ۶۷ کا فسٹ ڈویژن میں اور باقی ۲۳ کا سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہونا سکول کی تاریخ میں بے مثال کارنامہ ہے۔ وہاں انہوں نے شاہنشاہ معظم کی تاجپوشی کی یادگار میں ایک تعلیمی مجلہ بنام " مشعل " جاری کرنے کے ارادے کو نمبر ہذا کو عملی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ ان کا ارادہ ہے کہ یہ رسالہ اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اپنے کسی ہمعصر سے کم نہ ہو۔ اور جس مبارک تقریب اور جس بلند پایہ درسگاہ کے ساتھ منسوب ہے۔ ان کے شایان شان ہو۔ ان کو امید واثق ہے۔ کہ صوبہ ہذا اور دیگر صوبوں کے بہی خواہان تعلیم اس کی کامیابی میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اور اس بارے میں بھی صوبہ ہذا کو دیگر صوبوں سے ہمدوش کھڑا کر دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ اس کا وجود کسی وقت اللہ کے فضل سے سب متعلقین کے لئے باعث صد آفرین ہوگا۔ چونکہ رسالہ ہذا کو محکمانہ سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔ اسلئے وہ صوبہ کے سب سکولوں کی امداد اور توجہ کا مستحق ہے۔

ہر ایک خیرخواہ کی طرف سے اس کی بہتری اور ترقی کا مشورہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاوے گا۔ ہر ارادے کی تکمیل کرنے والی اور ہر ایک کوشش کو کامیابی عطا کرنے والی ذات سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس عاجزانہ سعی کو کامیابی کا سہرہ نصیب کرے۔ آمین ثم آمین۔

"مشعل"

شعلۂ طور سے مشعل کو جلاؤں یارب
ظلمت وجہل و تغافل کو مٹاؤں یارب

مثلِ خورشید زمانہ میں اجالا کردوں
قوم و ملت کے حجابوں کو اٹھاؤں یارب

بھولے بھٹکے بھی چلے آئیں ضیاء پر میری
راستہ دور سے منزل کا دکھاؤں یارب

درخورِ عرض نہیں بزم کی حالت لیکن
کھوٹے داموں کو کھرا کرکے دکھاؤں یارب

عالم الغیب ہے تو۔ تجھسے نہیں کچھ پنہاں۔
بارِ منت نہ سوا تیرے اٹھاؤں یارب

المدد غیث کرم! ہاتھ میں مشعل لیکر
قوم کو قعرِ مذلت سے بچاؤں یارب

صفدر امراض امم کا ہے معالج مولا
دردِ دل تیرے سوا کسکو سناؤں یارب

"صفدر"

بشارت

ایک رات میں اسی فکر میں دیر تک سرگردان وحیران تھا۔ کہ موجودہ تعلیم مدارس کی کس طرح اصلاح کی جاوے۔ اور اگر ملازمت کے اس آخری حصہ میں جبکہ اس صوبہ میں کام کرنے کا صرف ایک آدھ سال باقی ہے۔ کوئی تدبیر شروع کر بھی دی جاوے۔ تو کیا اس کی کامیابی کا کوئی امکان ہو سکتا ہے۔ اور اس کی بہتری کی صورت کونسی ہو سکتی ہے۔ کہ نیند نے آلیا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر عالم رؤیا میں یوں کیا دیکھتا ہوں کہ دور سے دریا پر سے ایک کشتی کے چند ملاح چلاتے سنائی دئے۔ جو شور مچا مچا کر پوچھ رہے ہیں کہ ٹھیک راستہ کدھر ہے اور کشتی کس جگہ لگائی جاوے۔ میں نے دھندلی فضا سے اور پہاڑی علاقہ کے رواج کے مدِ نظر مشعل اٹھا کر روشن کر کے گھاٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ راستہ میں ایک طرف پر ایک بزرگ صورت پاکیزہ سیرت نے۔۔ ایسے بوڑھے کو بے تحاشا دوڑتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ

ھاتف! او بوڑھے پنجابی۔ کدھر مشعل اٹھائے بے تحاشا دوڑے جا رہے ہو۔

میں۔ جناب پنجاب کے تعلیمی دریاؤں میں سے ایک دریا۔ اس طرف کو بھی بہ نکلا ہے۔ چونکہ علاقہ پتھریلا اور دریا کا طاس نیا ہے۔ اس کو عبور کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس کے لئے تجربہ کار ملاحوں کی ضرورت ہے جو کافی تعداد میں یہاں نہیں ہیں۔ اس لئے کام کی زیادتی نے ناتجربہ کار نوعمر نوآموز ملاحوں کی خدمات سے استفادہ پر مجبور کر رکھا ہے۔

وہ آدرسلامتی سب سے اول" کے اصول کے پیش نظر اس گزر کی نگرانی کے لئے مجھ ایسا بوڑھا پنجابی ناتجربہ کار نوجوان ملاحوں کی رہنمائی کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ کہ ان کو گھاٹ کا صحیح موقعہ دکھا کر آئندہ نسلوں کے نونہالوں کو تباہی سے بچا تا رہوں۔ سو اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے دوڑا جا رہا ہوں۔ اس غیر آباد علاقہ میں اور پھر ایسے وقت آپ کا وجود ظاہر کرتا ہے کہ آپ کوئی ہاتف غیبی ہیں۔

ہاتف۔ تو اس قدر جلدی کی کیا ضرورت ہے۔

میں۔ جناب اصلاحات موجودہ کے اجراء نے کشمکش حیات کو بہت تیز کر دیا ہے وہ اگلے وقتوں کا آرام سے اٹھنا بیٹھنا اور متانت سے چلنا گیا۔ بلکہ سروس کمیشن بورڈوں نے اپنے نت نئے اعلانات کے ذریعے ہر قابلیت کے اشخاص کے لئے جن کو حصول ملازمت سرکاری کی دُھن فوری پیشی کے ذریعے پہلی آسامی حاصل کرنے کا مشورہ دے رہی ہے۔ بڑی سخت تگ و دو پیدا کر رکھی ہے۔ بیچارے دن رات دیکھے بغیر ملاحوں کی اہلیت پر غور کئے بغیر جیسی بھی پرانی شکستہ کشتی اناپ شناپ ملاحوں کے چارج میں دیکھ پاتے ہیں۔ فوراً اس پر سوار ہو چل پڑتے ہیں۔ تاکہ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔ اور تاریخ پیشی گذر نہ جائے۔ اب اگر میں بھی مشعل اٹھائے ان ناتجربہ کار ملاحوں کو سرحدی پہاڑی حد کی دھندلی پرخطر فضاء میں صحیح گھاٹ کا نشان دینے میں قاصر رہوں تو خدا معلوم یہ اناڑی ملاح ان نوعمر جوشیلی سواریوں کو جن کے ... باپ بھی تاحال اس سفر کی مشکلات سے ناواقف ہیں۔ اسی تعلیمی ...

سے کہاں سے جا پھینکیں - اوران کے غلط مقام پر جا اترنے سے ان کی تمام امیدیں ہی خاک میں نہ مل جائیں- بلکہ کئی زندگیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے - بایں وجہ رات دن اس دوڑدھوپ میں لگا رہتا ہوں - کہ اس ذمہ داری سے بوجہ احسن عہدہ برا ہو جاؤں۔

ھاتف تم اکیلے اس عمر میں رات دن کی دوڑدھوپ کیسے کر سکتے ہو -

میں - خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے چند جوان عمر جوان ہمت ساتھی میرے اس کام میں شریک کر دئے ہیں -

ھاتف - وہ کون ہیں جن کی ہمت کے بھروسے پر ایک سفید ریش اس قدر مشکل کام اپنی کندھوں پر لینے کو آمادہ ہوگیا ہے -

میں - صاحب ایک کا نام فضل ہادی دوسرے کا محمد سلیمان تیسرے کا محمد جان چوتھے کا غلام سرور پانچویں کا منظور حسین چھٹے کا صدرالدین ساتویں کا غلام نبی -

ھاتف - کیا یہ سب نوجوان ہیں؟

میں - سب نوجوان نہیں ہیں- اکثر نوجوان ہیں - ہاں ایک دو عمر رسیدہ بھی ہیں- جوان تو ہیں ہی جوان- لیکن بوڑھے بھی ہمت کے جوان ہیں- اس لئے میں سب کو جوان ہی سمجھتا ہوں- کام کرنے کے لئے جوان ہمت ہونا ضروری ہے عمر جوان ہو نہ ہو-

ھاتف - یہ مانا کہ تمہارے ساتھی جوان ہمت ہیں - لیکن ملک کے دوسرے صوبوں کا مقابلہ کرنا آپ لوگوں سے مشکل ہے -

میں۔ صاحب مقابلہ نہ سہی تو دوسرے صوبوں کی پیروی کرکے تو منزل مقصود پر جا پہنچیں گے۔

ہم مانتے ہیں کہ ہم نے کام بہت دیر سے شروع کیا ہے۔ اور ہمارا تجربہ بھی اوروں سے کم ہے۔ لیکن نوجوان ملاحوں کے لئے جن کے حوالے قوم کی کشتیاں ہیں۔ ایک نہ ایک دن مشعل ہاتھ میں لے کر کھڑا ہونا ضروری تھا۔ سو اگر آج کھڑے ہوگئے ہیں تو آپ کی دعاء۔ قوم کی حوصلہ افزائی۔ دوستوں کے خلوص اور ہمت سے اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالےٰ کے لاانتہا فضل سے کافی توقع ہے۔ کہ ہم دیر سے روانہ ہونے والے بھی۔ اگر قدم کو تیز اور رفتار کو تیز تر کئے رہے۔ تو آگے نکل گئے ہوئے مسافروں کو کبھی نہ کبھی جا ہی لیں گے۔

ہاتف۔ حب سلیمان۔ ہادی برحق کا فضل۔ محمد کی جان۔ دین کا صدر۔ نبی کے سردار کے غلام اور حسین کے منظور آپ کے ساتھ ہیں۔ تو اللہ کا فضل آپ کو ضرور منزل مقصود پر پہنچا کر ہی رہیگا۔ مشعل کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اور جب تک ہو سکے اس کار خیر کو چلائے جاؤ۔

عزیز الرحمان

اُردو کی ترویج اور صوبہ سرحد

I دورِ حاضرہ میں منجملہ ان مسائل کے جو بالعموم زیر بحث ہیں۔ اور جن کی تائید اور تردید میں شاہسوارانِ میدانِ صحافت کے سمند تیز قلم نے دلائل و براہین کے میدان میں خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ اور دکھا رہے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے۔ جو زیب عنوان اور دیباچہ مضمون ہے۔ اور اسی پر آج کی صحبت میں ایک مقالہ حوالہ قلم کیا جاتا ہے۔

II مضمون ہٰذا کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کے لئے ہم اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

I کیا اس صوبہ میں اردو کو ہی اہل صوبہ کی زبان بنایا جائے؟

II کیا اردو کو موجودہ دور میں ذریعہ تعلیم بنایا جاوے؟

شق اول تو ہرگز قابلِ اعتنا ہی نہیں۔ اور نہ ہی یہ امر آسانی سے ہو سکتا ہے کیونکہ جہاں کوئی زبان مادری زبان ہو۔ اس کو چھڑانا اور دوسری زبان کو رائج کرنا اگرچہ ناممکن تو نہیں مگر متعسّر ضرور ہے۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ اس صوبہ میں نصف سے زائد آبادی کی زبان پشتو ہے۔ اور پشتو کو ایک قسم کا تفوّق حاصل ہے اور آبادی کا رجحانِ طبع اس طرف ہے۔ کہ صوبہ ہٰذا کی خصوصی زبان پشتو ہو۔ اور باقی آبادی کی زبان ہندکو یا ہندوستانی ہے۔ رہا یہ امر کہ

I کیا ممکن ہے کہ اُردو (ہندوستانی) کو ذریعہ تعلیم بنایا جاوے۔ جیسا کہ ہے۔

II کیا یہ مناسب ہے۔ کہ بجائے السنہ مروجہ کے اردو کو مرکز توجہ بنایا جاوے۔
سو اسی حصہ پر ہم مشعل کے صفحات میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی جرأت کرتے ہیں، تاکہ گم گشتگان بادیۂ تحریک کے لئے یہ مشعل رہنمائی کا کام دے۔

ہم بحث ہذا پر اپنے نکتہ نظر کو واضح کرنے سے قبل یہ ظاہر کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہم اس امر کے ہرگز مخالف نہیں۔ کہ صوبہ ہذا میں ذریعہ تعلیم صوبہ کی مروجہ زبان ہو اور ہمیں پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کے مندرجہ ذیل الفاظ سے بکلی اتفاق ہے۔ جو یہ ہیں۔ " طلباء کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے۔ کہ وہ مغربی علوم کو ایک غیر زبان کے واسطے سے حاصل کرتے ہیں۔ غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کیلئے اس پر عبور حاصل کرنے میں طلبہ کا بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ شاید ان کی تعلیم کی پوری مدت کا ایک تہائی حصہ اس کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ کہ بہت سے اس تمام کاوش کے بعد وہ مقصد حاصل بھی کر جاتے ہیں۔ یا نہیں " دیکھو۔ ۱۱۔ ۱۲۔ صفحہ پنجاب ایجوکیشنل جرنل اردو ایڈیشن۔ زیر عنوان اعلیٰ تعلیم اور مادری زبان از خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹرننگ کالج علی گڈھ۔ مگر افسوس کہ صوبہ ہذا کی ایک متحدہ زبان نہیں۔

اس کے بعد اثبات مدعا کے لئے مندرجہ امور عرض ہیں۔

I سرحدات بالعموم لشکرگاہیں ہوتی ہیں۔ اردو کے معنے لشکر کے ہیں۔ پس اردو کو سرحد سے خارج کرنا گویا چھاؤنی سے فوج کو باہر کرنا ہے۔ جو بہت ہی نازیبا حرکت ہو گی۔

مصنف تاریخ ادب اردو صفحہ ۲ میں فرماتے ہیں " یہ ضرور صحیح ہے کہ لشکر

یا بازار سے اس زبان کی نشوونما اور ترقی کو اس قدر تعلق ضرور تھا۔ کہ اس کا نام ہی اردو ہو گیا۔ جس کو زبان ترکی میں لشکر کہتے ہیں۔" پھر اس کتاب کے صفحہ ۵ میں لکھا ہوا ہے "جب دہلی پایۂ تخت ہو گیا۔ اور بادشاہ مع لاؤ لشکر کے وہاں رہنے لگا۔ تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط ضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوا۔ کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے" اقتباسات بالا سے ظاہر ہے۔ کہ اردو ایک فوجی زبان ہے اور باہمی میل جول کا ذریعہ۔ پس یہ بدیہی نتیجہ ہے۔ اس امر کا کہ سرحد مقام ہے اردو کا اور اردو ہے سرحد کے لئے۔ یہ دلیل اگرچہ ذوقی ہے۔ مگر ذوق صحیح کے برخلاف بھی نہیں۔ فتدبّروا۔

۲ (الف) صوبجاتی آزادی نے باہمی صوبجات میں ایک گونہ افتراق اور علیحدگی پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ ہر صوبہ کی تمام توجہ کا مرکز اس کے اپنے صوبے کی بہبودی ہے۔ ہر ایک شخص اس خیال میں مگن ہے۔ کہ اسی کا صوبہ ترقی کرے۔ اور اس کی مجذوبیت اس جذبہ شدیدہ میں انتہائی کمال تک پہنچی ہوئی ہے جتنی کہ اسے اور کچھ بھاتا ہی نہیں۔

(ب) چونکہ صوبہ ہذا ہندوستان کا ایک صوبہ ہے۔ اور مشترکہ مفاد میں ہندوستان کے ہر ایک صوبہ کے ساتھ اس کا تعلق غیر منفک ہے۔ اور ہر صوبہ مجبور ہے کہ دوسرے صوبہ کے حالات سے باخبر رہے۔ گویا باوجود علیحدگی ایک اجتماعی حالت کی ضرورت ہے

۳۔ صوبہ ہذا باقی صوبجات کے مقابلہ میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ حیثیت یہ ہے کہ یہ صوبہ بلحاظ اپنے محل وقوع اور بلحاظ اپنی شجاعت و تہور کے محافظ ہند

کا رتبہ رکھتا ہے۔ اور ایک کروڑ سے زائد رقم ہندوستان کے خزانے سے اسے عطا ہوتی ہے تاکہ وہ باقی صوبجات کے برابر ہو جائے۔ اپنی کوتاہیاں اور خامیاں دور کر سکے۔ اور اس قدر ترقی پائے۔ کہ بہترین محافظ بن سکے۔

مقدمات مذکورہ بالا بدیہی ہیں۔ نظری نہیں۔ کہ ان کی وضاحت کے لئے دلائل کی ضرورت ہو۔ پس ہم کہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے اندر اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کے لئے اور صوبہ ہذا کو اپنے مشترک مفاد کے حصول کیلئے یعنی اپنی کہنے دوسرے کی سننے اور سمجھنے کیلئے ایک ایسے ذریعے کی ضرورت ہے۔ جو سب کو باہم ملا دے۔ آسان ہو۔ اور بہت زیادہ محنت نہ کرنا پڑے۔ پس ہم کہتے ہیں۔ وہ ذریعہ صرف اردو زبان ہے۔ اسے اردو کہو۔ یا ہندوستانی نام رکھو۔ کیونکہ یہ زبان بنائی ہی اسی واسطے گئی تھی۔ اور اسی وقت سے کر اب تک سب اقوام ہند بلا امتیاز مذہب و قومیت اسی کو استعمال کرتے رہے۔ اور باہمی اختلاط اور میل جول میں اسی کے ذریعے اظہار خیالات کرتے رہے۔ بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ محب کسان گجرات تاجپوشی نمبر ۱۲/۱۳ مئی ۳۷ء "اردو کی ہمہ گیری" "ملک معظم کی تاجپوشی کے جشن میں شامل ہونے کیلئے ہندوستان کے مختلف حصوں سے جو فوجی افسر انگلستان گئے ہیں۔ ان کی تعداد ۶۸۲ ہے۔ یہ لوگ مختلف قوموں مختلف صوبوں اور ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ ان سب کے قیام کے انتظام کرنے کیلئے ایک افسر میجر جیکے مقرر ہیں۔ رپوٹر اطلاع دیتا ہے۔ کہ ان (۶۸۲) افسروں کے کیمپ میں مشترک زبان اردو ہے۔ یعنی یہی صرف ایک ہندوستانی زبان ہے۔ جسے ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور ہر حصہ سے آئے ہوئے فوجی افسر یکساں بولتے اور سمجھتے ہیں" دیکھو صفحہ ۱۳۔

اور سنئے۔ ہندی اور اردو کے جھگڑے پر پنڈت جواہر لعل نہرو نے ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی ہے۔ اس میں ایک جگہ پنڈت جی یہ لکھتے ہیں "بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ میں بصد ادب عرض کرونگا کہ میں اسے ماننے کیلئے تیار نہیں۔ اردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں۔ جسے میں بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں" پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی مسلم یونیورسٹی یونین میں اردو کانفرنس کے سٹیج پر "اردو ہماری زبان" کہہ کر فرماتے ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے۔ کہ اردو قوموں کے میل جول اور دیسی بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہوگئی۔ لیکن بعد میں ہندو اُس کو اپنی زبان سمجھتے رہے۔ اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ ....

.... ہندوؤں کے دھرم پرچار کے سلسلے میں اُردو اختیار کی گئی یا نہیں؟ اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے۔ تو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ اردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کیلئے استعمال کیا .. ..جب اشاعت دھرم میں کمی ہوئی۔ تو مہابھارت۔ رامائن۔ گیتا۔ مہانم۔ شیو پران گنیش پران وغیرہ دھرم پستکیں اردو میں ترجمہ و تصنیف ہوئیں" دیکھو رسالہ ہمایون ماہ اپریل ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۱۵" ان اقتباسات سے یہ امر ظاہر ہوگیا کہ اردو زبان ہی ایک متحدہ زبان ہے اور اسی کے ذریعے ہر ایک ہندوستانی آدمی دوسرے کے ساتھ اظہار خیال کرتا ہے۔ باقی آسان ہونے کے بارے میں یہ عرض ہے۔ کہ صوبہ ہذا کی آبادی پشتو اور بگڑی ہوئی ہندوستانی یعنی ہندکو جانتی اور بولتی ہے۔ جیسے جغرافیہ صوبہ سرحد صفحہ ۴ میں لکھا ہے۔ کہ صوبہ سرحد میں قریباً چوبیس لاکھ آدمی بستے ہیں۔ پشتو اور ہندکو دونو ملی جلی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔

پشاور۔ پشاور خاص اور اس کے گرد و نواح میں جو دیہات تپہ خالصہ کے ہیں۔ ان کی زبان پنجاب سے ملتی ہوئی ہی ہے۔ جسے بزبان پشتو ہندکو کہا جاتا ہے۔ جو دیہات نوشہرہ کی تحصیل میں برلب سڑک شاہی واقع ہیں۔ ان میں زبان چھاچھیوں کی سی ہے۔ (یعنی اضلاع کامل پور۔ راولپنڈی کے باشندوں جیسی) باقی کل ضلع میں زبان پشتو جاری ہے۔ خاص شہر پشاور گوان کی مادری زبان پنجابی ہے۔ مگر پشتو وغیرہ بھی سمجھتے ہیں۔ جغرافیہ ضلع پشاور صفحہ ۵۲۔

ہزارہ۔ شمال اور مغربی علاقوں میں پشتو بولی جاتی ہے۔ مگر مشرقی اور جنوبی حصوں میں ہندی زبان ہے۔ جسے یہاں کے لوگ ہندکو بولتے ہیں جغرافیہ ~~ہزارہ~~ صفحہ ۵۵۔

کوہاٹ۔ خاص شہر میں زبان ہندکو ہے۔ اور علاقہ میں بھی حالات مختلف ہیں۔ ہندکو اور پشتو ملی جلی بولی جاتی ہیں۔

بنوں۔ خاص شہر میں ہندکو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ علاقہ میں پشتو۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ خاص شہر میں ہندی زبان بولی سمجھی جاتی ہے۔ لوگ بعض جگہوں میں پشتو بھی جانتے ہیں۔ جغرافیہ صوبہ سرحد صفحہ ۸۰

اس تفصیل سے ظاہر ہے۔ کہ اگرچہ صوبہ ہذا میں پشتو بھی ہے۔ مگر ہندکو اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے یہاں کے لوگ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اردو بولیں اور سمجھیں۔ کیونکہ ہندکو تھوڑے فرق سے اردو سے ملتی جلتی ہے۔ پس یہ زبان ان کے لئے زیادہ آسان ہے۔ میں بحیثیت مدرس گورنمنٹ ٹریننگ اسکول اس بات

کا صحیح تجربہ رکھتا ہوں۔ کہ طلبائے ہزارہ و ڈیرہ کس طرح پشتو سے گھبراتے ہیں۔ مگر
اُردو تو سبھی جانتے ہیں۔ اور پشتو اگرچہ بولی جاتی ہے۔ مگر خود بولنے والوں میں ۵ فیصدی
لوگ ایسے ملیں گے۔ جو پشتو کو پڑھ سکیں "پس ہمو دل دو رست" والا معاملہ ہے۔
اگر قومی یا ملکی زبان رائج کرنے کا انتظام کیا جاوے۔ تو صاف ظاہر ہے۔ کہ اور تنازعات
پیدا ہوں گے۔ مثلاً ہندکو بولنے والے اضلاع اس پر مُصر ہوں گے۔ کہ ہندکو ذریعہ
تعلیم ہو۔ اور پشتو والے پشتو پر اصرار کریں گے۔ اور ہندی اور ناگری کا جھگڑا الگ
اٹھ کھڑا ہوگا۔ پھر علاقہ علاقہ کی زبان میں فرق ہے۔ قومی اور خیلی تعصب اس قدر
الجھنیں پیدا کرے گا۔ کہ شہنشاہ اکبر کے گنگ عام کا نقشہ صوبہ ہذا کی سرزمین میں
نظر آئے گا۔ اس تحریک اور زور یع سے یہ مقصد بھی مراد نہیں لیا جاسکتا۔ کہ شاید
ملکی زبان کو مٹا دینے کے سامان ہیں۔ کیونکہ اول تو یہ امر متعسر ہے۔ اور دوسرا
ہمارا یہ منشا ہی نہیں کہ ملکی زبان کو فنا کر دیا جاوے۔ مدت سے پنجاب میں اردو کا
رواج ہے۔ مگر پنجابی بدستور قائم ہے۔

۴ ۔ دور جدید میں محترم اور باوقار وہی ہستی ہے۔ جو اپنے ساتھ اکثریت کی تائید رکھتی
ہو۔ وہی شخص کرسیٔ ممبری پر رونق افروز ہو سکتا ہے۔ جو اپنی تائید میں اکثریت
رکھتا ہو۔

اس سوال کے ماتحت جب ہم زبان اردو کے مسئلہ پر نظر کرتے ہیں۔ تو ڈگری اسی کے حق
میں پاتے ہیں۔ کیونکہ السنہ مروجہ میں کوئی زبان اتنی اکثریت کی مالک نہیں جس قدر
کہ اردو ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس سے قبل اگر کوئی اور زبان ان صفات کی حامل ہوتی
جس سے مختلف لوگ اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکتے۔ تو اس کی ضرورت ہی کیوں پڑتی۔

پھر یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے۔ کہ باقی زبانیں صوبہ صوبہ کی یا قوم قوم کی ہیں۔ پنجابی پنجاب میں۔ پشتو اور ہندکو سرحد میں۔ سندھی سندھ میں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ پس وہ زبان جو اس غرض کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ وضع ہی نہیں کی گئی۔ اس ضرورت کو پورا کیسے کرے۔ پس ہم اہالیان صوبہ سرحد پر اکثریت کا احترام واجب ہے۔ اور اگر بالفرض اور کوئی دلیل ترویج اردو کے باب میں نہ بھی ہو۔ تاہم یہ ایک ہی دلیل اس قدر وزنی ہے۔ کہ اُردو کا پلّہ بھاری ہو جاتا ہے۔

۵۔ زندہ قوم کا نشان یہ ہے۔ کہ وہ ہر ایک موجودہ مفید شے سے فائدہ اٹھاتی ہے اور ساتھ ہی اپنی ذاتی اشیاء کی ترقی کی خواہشمند ہوتی ہے۔ جیسے کہ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ع

مرد باید کہ گیرد اندر گوش   ور نبشت است پند بر دیوار

اس خیال کے ماتحت بھی جب ہم زبان اردو پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اس کو نہ چھوڑیں۔ کیونکہ مختلف علوم و فنون مثلاً تفاسیر، فقہ، تواریخ، سیرت اور سائنس، علم قرأت۔ طب قدیم و جدید۔ ہومیوپیتھک، ڈاکٹری وغیرہ انگریزی۔ عربی۔ فرانسیسی، جرمنی۔ کتب سے اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اور ہو رہی ہیں۔ متعدد رسائل ادبی۔ تعلیمی صنعتی، دستکاری کے اس زبان میں نکل رہے ہیں۔ صرف حیدر آباد کے دار الترجمہ کے رسائل کی فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱) ۱۹۲۶ء میں مجلہ عثمانیہ سہ ماہی اُردو و انگریزی (۲) ۱۹۲۶ء میں تجلّی سہ ماہی اُردو۔
(۳) ۱۹۲۶ء آئین دکن ماہوار۔ اُردو۔ (۴) ۱۹۲۶ء رقیت ہفتہ وار۔ اُردو۔

دکن) ۱۹۳۷ء نظام گزٹ ہفتہ وار اُردو۔ (6) روزنامہ دکن اردو۔ (7) ۱۹۳۲ء المجایت اردو۔ (8) ۱۹۲۹ء مشیر دکن۔ (9) دکن پنچ۔ (10) ورزش جسمانی (11) تاریخ (12) مجلہ مکتبہ (13) رسالہ سائنس۔ (14) حیدرآباد ٹیچر۔ (15) اشاعت (16) ارشاد۔ (17) قدس۔ (18) روزنامہ صبح دکن۔ (19) کشافہ۔ (20) ہجولی (21) سفینۂ نسواں۔ (22) روزنامہ منشور۔ (23) خلیق ۱۹۳۱ء۔ (24) الاعظم (25) ترجمان القرآن (26) کاشتکار۔ (27) حسن کار ۱۹۳۳ء۔ (28) شہاب (29) الموسیٰ ۱۹۳۵ء ورنگل کالج میگزین ۱۹۳۶ء (30) داستان گو (31) آئینہ ادب (از رسالہ المعارف صفحہ ۳۷۶) ان میں سے کئی بند ہوگئے۔ اور کئی جاری ہیں۔ یہ رسائل صرف حیدرآباد سے نکلتے ہیں۔ اگر لاہور اور دیگر مقامات کے کتب و رسائل کی فہرست دی جاوے۔ تو ایک ضخیم مجلّہ درکار ہے۔

۶۔ صوبہ سرحد میں اس وقت جس قدر جرائد اور رسالے جاری ہیں۔ ان میں بڑی بھاری تعداد اردو میں ہے۔ جس سے صوبہ ہذا کے طبع کا رجحان معلوم ہو رہا ہے اور مشعل کا اجراء اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۷۔ امّا ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔ دور شاہجہانی سے لے کر اب تک زبان اردو رُو بہ ترقی ہے۔ اور اب تک تو صرف ہندوستان کے لوگوں میں میل ملاپ کا ذریعہ تھی۔ مگر اب اس نے اپنا اثر ملحقہ صوبوں میں بھی ڈالنا شروع کر دیا ہے چنانچہ ہفت روزہ ادبی۔ نگاہی۔ شیرازہ اپنی تازہ اشاعت مورخہ ۱۶ جولائی میں صفحہ چھ پر لکھتا ہے " اب کشمیر میں اردو کا رواج عام ہے۔ دفتری زبان بھی اُردو ہے۔ اور خط و کتابت بھی اسی زبان میں ہوتی ہے " پس وہ زبان جس کو بوجہ اس کے آسان۔

مفید اور نافع ہونے کے ملحقہ صوبجات بھی اختیار کئے جا رہے ہیں اس زبان کو ہندوستان کے ایک صوبہ سے کس طرح خارج کیا جا سکتا ہے۔ اور کہاں تک یہ امر موزوں ہو سکتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔

۸۔ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جب کسی بات کو اختیار کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ اس میں یہ امر مدّ نظر ہوتا ہے۔ کہ اس بات میں فوائد بمقابلہ مضرات زیادہ ہیں۔ اس اصول کے ماتحت بھی ہمیں اسی زبان کو ذریعۂ تعلیم، خط و کتابت باہمی میل جول کیلئے اختیار کرنا مفید ہوگا۔ کیونکہ اس میں منافع زیادہ ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اور مضرات بہت کم۔

اب ہم اس مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔ اور اہل سرحد سے مؤدبانہ استدعا کرتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے ہیں۔ کہ پشتو کو ترقی ہو۔ جو ہمارا حق ہے۔ تو اس کی اشاعت کے سامان مہیا کریں۔ کتب اور رسائل اسی زبان میں لکھیں۔ اور مفید علوم کے ترجمے پشتو میں کریں۔ تصنیف و تالیف کو عروج دیں۔ اور اس باب میں خون اور پسینہ ایک کریں۔ تاکہ پشتو مخزن علوم و معدن فنون بن کر ایک دنیا کیلئے آرام گاہ بنے۔ مگر ساتھ ہی اردو کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ بہر کیف ہندوستان کے ساتھ تعلقات رکھنے کا بہترین اور واحد ذریعہ یہی ہے۔ اور جب تک یہ صوبہ ہندوستان کا جزو ہے۔ ہندوستانی (اردو) سے چھٹکارا نہیں۔ کسی نے کیا ہی اچھا کہا ہے

شعر

شہد و شکر سے شیریں اُردو زبان ہماری   ہوتی ہے جس سے میٹھی ہر دم زبان ہماری
کشمیر سے دکن تک برما سے تا بہ کابل   سب کی زبان پر ہے یہ حکمران و جاری

صدر الدین

علم جغرافیہ کے ارتقاء پر ایک نظر

ہر ایک چیز کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ ترقی کر کے اپنے معراجِ کمال کو پہنچتی ہے۔ اسی اصول کے ماتحت انسانی تہذیب بھی بتدریج پتھر اور دھات کے زمانے میں سے گذر کر اس ترقی یافتہ حالت پر پہنچی اور اس کے پہلو بہ پہلو کئی علوم نے ترقی کی اور ان میں سے سب سے پرانا علم جغرافیہ ہے۔ اس کی ارتقائی داستان بالکل انسانی تہذیب کی ترقی کی داستان ہے۔ اسلئے اسکا بیان کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا۔

زمانہ قدیم:۔ انسانی سوسائٹی کے بالکل ابتدا میں بھی جبکہ دنیا میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ اسوقت کے وحشی انسان اپنی ماحول اور گردونواح کے متعلق پوری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنکا جغرافیہ بالکل تنگ دائرے میں مقید تھا۔ مگر پھر بھی ان کی ضروریات کیلئے کافی تھا۔

انسان نے جلد ترقی کر لی اور جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے کی بجائے شہروں میں آبسا۔ آبادی کے ابتدائی مراکز مصر و بابل تھے۔ ان کی تہذیب کے عروج کے زمانہ میں لوگوں کی معلومات پہلے سے بہت زیادہ تھیں۔ صحرائے اعظم افریقیہ اور فارس کا درمیانی علاقہ ان کا گہوارہ تھا۔ اس زمانے میں لوگوں نے نہ تو لمبے لمبے تجارتی سفر کئے اور نہ ہی غیر ممالک کی سیاحت کی۔ مگر پھر بھی انہوں نے Astronomical جغرافیہ کی بنیاد رکھی۔ اس قسم کے نقشہ جات بابل اور مصر کے کھنڈرات میں سے دستیاب ہوئے ہیں۔

1000 قبل مسیح جب یہودیوں نے شامیوں کو شام اور فلسطین سے خارج کر دیا۔ تو

انہوں نے بحیرہ روم کے مختلف جزائر کو اپنا مسکن بنایا۔ اور اسی وجہ سے جہازرانی کا فن بھی سیکھ لیا۔ ان جہازوں کے ذریعے وہ ایشیا اور یورپ کے درمیان تجارت بھی کرتے تھے۔ اور سیاحت بھی۔ ساری تجارت اُن کے ہی قبضہ میں تھی۔ انہوں نے بحیرہ روم اور اسکے ساحل کا چپہ چپہ معلوم کر لیا۔ اور اسطرح سے دنیا کی معلومات میں اضافہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ میں وحشی بستے تھے۔ اور تہذیب اور شائستگی ان سے کوسوں دور تھی۔

500 ق م میں یونانی تہذیب زوروں پر تھی۔ یونانی ملک پر ملک فتح کر کے اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع بنا رہے تھے۔ انہوں نے ہر ایک علم کی پرورش کی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے معلومہ دنیا کا نقشہ بھی تیار کیا۔ اور ایک یونانی مصنف ہیروڈوٹس نے 450 ق م میں ایک کتاب جغرافیہ پر لکھی۔ اور اس میں اس وقت کی معلومہ دنیا کا نقشہ بھی تھا۔ اس نقشہ میں بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کے خطے۔ ایشیائے کوچک مغربی ہندوستان اور شمالی افریقہ دکھائے گئے ہیں۔

یونانیوں نے Astronomical جغرافیہ میں بہت سا کام کیا۔ انہوں نے پہلی دفعہ دنیا کو زمین کے گول ہونے سے آگاہ کیا۔ اور اسی زمانے میں ایک یونانی جغرافیہ دان اراٹوستھینس نے جو کہ سکندریہ کا رہنے والا تھا۔ زمین کا محیط معلوم کیا۔ جو کہ موجودہ تحقیقات کی کسوٹی پر بھی تقریباً ٹھیک اترتا ہے۔ یونانیوں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر بہت سے ملکی نقشے بھی تیار کروائے۔ ان سب میں پرانا نقشہ جسکا ہمیں علم ہے۔ وہ ہیکیٹس نے 500 ق م میں بنایا تھا۔

یونان کے زوال کے بعد روم والوں نے طاقت پکڑی۔ اگرچہ انہوں نے یونانیوں کے جغرافیائی معلومات پر چنداں اضافہ نہیں کیا۔ مگر پھر بھی انہوں نے اپنے ماتحت

ممالک کے مفصل اور درست نقشے تیار کروائے۔ اور اس طرح سے جغرافیہ میں درست نقشوں کے بنانے کی ضرورت کا احساس کرایا۔ اور خود اس کی ابتدا کا بنیادی پتھر رکھا۔

زمانہ قدیم کی جغرافیائی معلومات کا مفصل ذکر سٹر یبو (۵ 2 ق م) اور پٹلمی (۱۵۰ء) کی تصنیفات میں موجود ہے۔

زمانۂ وسطی:- علم جغرافیہ کی ترقی کے لحاظ سے بالکل اندھیرا ہمہ ظلمت زمانہ تھا اس زمانہ میں یورپ قبائلی خانہ جنگیوں میں معروف تھا۔ اسی لئے علوم کی بہتری کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ لوگوں میں جذبۂ مذہبی زوروں پر تھا۔ عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ زور و عروج پر تھا۔ عیسائیت نے اپنے پیروؤں میں روحانیت مذہبی جنوں کے حد تک پیدا کی ہوئی تھی۔ اور اسی لئے عیسائی دنیادی تعلیم اور علمی نظریوں کو نگاہ بد سے دیکھتے تھے۔ اور اپنے عقائد کے زیر اثر زمین کو چپٹا مانتے تھے۔ اور ان کے عقیدہ کے مطابق زمین چاروں طرف سے سمندر سے گھری ہوئی تھی۔ اور اس سمندر میں بڑے بڑے ہیبتناک شیاطین اور دیو بستے تھے۔ اسی خوف نے کئی صدیوں تک لوگوں کو سمندر میں جانے سے روکے رکھا۔ اور دنیا کی معلومات اور تہذیب کو کئی سو سال پیچھے کر دیا۔

عیسائیوں کے برخلاف مسلمانوں نے ہر ایک علم اور علمی تحقیقات کو اپنے اندر جگہ دی۔ انہوں نے یونانیوں کے اعلیٰ نظریوں کو نہ صرف قبول کیا۔ بلکہ اپنی تحقیقات سے ان میں بہت حد تک اضافہ بھی کیا۔ اور ان تمام علوم کو اپنی اعلیٰ درجہ کی

درسگاہوں کے ذریعے سے دنیا میں پھیلایا۔ مسلمان اپنے مذہب کی اشاعت کی خاطر دنیا کے ہرایک کونے میں پہنچے۔ ہرایک حصے سے تجارتی تعلقات پیدا کئے۔ اور تمام دنیا کو ایک ہی لڑی میں منسلک کر دیا۔ اور آپ یہ سُن کر حیران ہو گئے۔ کہ مسلمان کولمبس اور اسکے ساتھیوں سے پہلے امریکہ پہنچ چکے تھے۔ اور آجکل بھی جزائر غرب الہند میں بعض جزائر کے حکمران مسلم ہیں۔ مسلمانوں نے علم جغرافیہ کو جسکو عیسائیوں کے مذہبی جنون نے پس پشت ڈال دیا تھا۔ دوبارہ زندہ کیا۔ جغرافیہ کے متعلق کتابیں لکھی گئیں۔ نقشے تیار کئے گئے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کی لڑائیاں جو کہ صلیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے بھی جغرافیائی معلومات کی زیادتی میں مدد کی۔ ہر دو اقوام میں غیر ممالک کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور کئی پادریوں اور مسلمان مبلغوں نے دور دراز ممالک کے تبلیغی دورے کئے۔ اپنی سیاحت کے حالات قلمبند کئے۔ اور اسی طرح سے عوام کی جغرافیائی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کیا۔

قوموں کی تجارتی تگ و دو نے بھی جغرافیہ کی بہت مدد کی۔ اسی سلسلے میں کولمبس امریکہ جا پہنچا۔ واسکوڈی گاما ہندوستان وارد ہوا۔ اور ہرایک ملک نے تجارتی شاہرا میں تلاش کرنے کیلئے اپنے بہادر ہرطرف دوڑائے۔ ان ممالک کو جو فائدہ ہوا۔ اسکے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ مگر انہوں نے غیرارادی ذریعہ سے جغرافیائی معلومات میں بہت زیادہ اضافہ کیا۔ انہوں نے افریقہ کے جنگل اور وحشی دیکھے۔ ہر وقت مد و جزر والے سمندروں سے گزرے۔ اُن کی وجوہات پر غور کیا کہ کس طرح ان مشکلات پر عبور حاصل کیا جاوے۔ ہرملک نے اس [illegible]

بہت سا تحقیقاتی کام کیا۔ اور اقوام کی تجارتی رقابت نے علم جغرافیہ کی بہت ہی زیادہ توسیع کی۔

زمانہ حال:- علم جغرافیہ کو پورا عروج حاصل ہوا۔ جغرافیہ دانوں نے زمین کو ماپا۔ سمندروں کی گہرائیوں کو معلوم کیا۔ زمین سورج اور دیگر فلکی اجسام کا بغور مطالعہ کرکے بہت سے قوانین وضع کئے۔ علم جغرافیہ کی تشنگی کی تسکین کی خاطر قطبین تک جا پہنچے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کو روندا۔ خطرات سے پر جنگلات کی بادیہ پیمائی کی۔ غرضیکہ کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی جس کی ماہیت پر غور نہ کیا ہو۔

اس زمانہ نے جغرافیائی معلومات کو درست طریقہ پر جانچنے کیلئے بہت سے آلات تجویز کیئے۔ جن کے استعمال نے بہت سے ناممکن معلومات کو بالکل درست اور صحیح طور سے معلوم کر لیا۔

دنیا کے ہر ایک حصّہ کی زمین کی ترکیب کو جانچا گیا۔ اس کے اجزا معلوم کئے گئے۔ ایسے نفیس اور مکمل نقشے تیار کئے گئے جس میں زمین کی شکل وصورت کے چپے چپے کی تفصیل موجود ہے۔

ان تمام ذرائع کی موجودگی میں ابھی دنیا میں جغرافیہ دانوں کے لئے بہت سا کام باقی ہے۔ کیونکہ ابھی تک ایسے مقامات موجود ہیں۔ جن تک قدرتی مشکلات کی وجہ سے وہ پہنچ نہیں سکے۔ ان میں ایک مونٹ ایورسٹ کی چوٹی ہے جس پر کئی طرف سے چڑھائی کی گئی۔ روپیہ خرچ کیا گیا۔ جانیں قربان ہوئیں۔ مگر ... وہ سر نہ ہوئی۔ کوشش جاری ہے۔ اور ان گرمیوں میں بھی ایک جرمن

جماعت اس کو سر کرنے کے لئے آئی ہوئی ہے۔

حال ہی کی تازہ خبر سے معلوم ہوا ہے۔ کہ اس مہم کی کوششوں کو بھی چنداں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

محمد سلیمان

بچّوں کے حرکات کی رہنمائی

بچپن میں جب کہ فطرت بچے کو اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب گردوپیش کی چیزوں کو برت کر، بنا کر، بگاڑ کر، توڑ کر، جوڑ کر سمجھنے اور ان سے تعلقات قائم کرنے پر طبیعت اسے دم بدم اکساتی ہے۔ جب وہ اپنے حواس کی مشق چاہتا ہے۔ جب وہ اعضاء و جوارح کے استعمال سے ان کی قوّت کا احساس اپنے اندر قوی کرنا چاہتا ہے یعنی جس عمر میں معمولی بچّوں کی بہت بڑی اکثریت کا رجحانِ طبع عمل اور تجربے کی طرف ہوتا ہے۔ اس عمر میں ہم اُن کو صرف کتابیں دیکر تنگ و تاریک مکانوں میں قیدیوں کی طرح نہ بٹھائیں۔ اور انکو ان کے فطری ماحول سے جدا کرنے کی وہ مؤثر تدبیریں نہ کریں جو ہم اپنے ابتدائی مدارس میں کرتے ہیں۔ شاید ہم اصلاح اور تبدیلی کی ایسی تدبیریں نکال سکیں جن سے ہمارے ان ابتدائی مدرسوں میں سہمے ہوئے، پژمردہ چہرے کی جگہ خوش و خرم، ہنستے بولتے بچے دکھائی دیں۔ اور ہمارے مدرسوں کی قبرستانوں جیسی خاموشی بس پہاڑوں کی رٹائی اور سزا پاکر چیخنے کی آوازوں ہی سے نہ ٹوٹے۔ بلکہ ان کی فضا، بچوں کی ہنسی، ان کے کھیل کے شور اور اُن کے کام کی ہماہمی سے معمور ہو۔ تاکہ تقاضائے فطرت کے خلاف محض کتابی تعلیم پاکر اُن کی اُبھرتی ہوئی صلاحیتیں پوشیدہ یا پژمردہ نہ ہو جائیں۔

(ماخوذ از خطبہ صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

نصب العین

نصب العین کی ماہیت اور اصلیت کو سمجھنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کہ انسان زندگی کی حقیقت اور اس کی خصوصیات پر غور کرے۔ فرانس کے ایک نامی گرامی ماہر مابعد الطبعیات (برگسان) اپنی کتاب "تخلیقی ارتقا" (Creative Evolution) میں لکھتے ہیں۔ کہ زندگی کی بڑی سے بڑی خصوصیت "حرکت" ہے۔ اب ہر قسم کی حرکت جسکا کہ ہم ایک زندہ عضویہ (Organism) سے انتساب کرتے ہیں۔ سادہ نہیں بلکہ نہایت پیچیدہ ہے۔ ایمیبا (Amoeba) (یک خلوی عضویہ) کی خفیف سے خفیف حرکت میں بھی اپنی ذات کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کا رحجان نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ یعنی سادہ سے سادہ زندگی کی شکل میں بھی جوش حیات کے عالمگیر اصول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایمیبا کی حرکات ہمارے نقطۂ نگاہ سے نہایت سادہ اور ابتدائی ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے طفیل اپنی اضطراری خواہشات کی تسکین اتفاقیہ طور سے کرتا ہے۔ اس کو معین طور سے معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اُس کی خوراک کہاں ہے۔ تاکہ براہِ راست جا کر اپنی اشتہا کی تشفی کرے۔ وہ اپنی حرکت جاری رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی خوراک پر اتفاقاً پہنچ کر اپنی بھوک کی تشفی کر لیتا ہے۔ یعنی ایمیبا اور دیگر اس صنف کے خفیف جانداروں میں گو حیاتی توانائی کا عالمگیر اصول عمل پیرا ہوتا ہے۔ تاہم انکی حرکات قریباً قریباً غیر شعوری ہوا کرتی ہیں۔ اس قسم کے جاندار کی بجائے کیڑے مکوڑوں

کی حرکات کی طرف اگر التفات کی جائے۔ تو صاف طور سے نظر آئیگا۔ کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کے حصول میں قدرے سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ یا تو ان کے حواس نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ اور قدرے امتیازی ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کے طفیل جانتے ہیں۔ کہ ان کی خوراک وغیرہ کہاں اور کس طرف ہوتی ہے۔ جیسے گوبریلا جھٹ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں گوبر پھینکا جاتا ہے۔ اس قسم کے جاندار کی حرکات بھی قریباً غیر شعوری ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کو قطعی اور معین طور سے حرکات کی غایت یا مقصد کا شعور نہیں ہوتا۔ ان کو عضوی خواہش ہوتی ہے۔ اور وہ لازماً ایک خاص اور مخصوص حرکت پر مجبور ہو کر اسی شے پر پہنچ آتے ہیں۔ جس سے ان کی اضطراری خواہش کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی حرکات خالص جبلی حرکات کہلاتی ہیں۔

مختصر ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ جتنا ہم بڑے جاندار کی حرکات کی طرف غور کرینگے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ ان کی حرکات عموماً جبلی ہوتی ہیں۔ لیکن قدرے شعوری بھی ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے اضطراری اور عضوی حرکات کو چھوڑ کر انسان کی قریباً تمام دیگر حرکات شعوری ہیں۔ اور جیسے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ شعوری حرکات کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں مقصد یا غایت کا شعور ضرور ہو۔ اس لئے اس قسم کی حرکات کو ہم فعلیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ہماری فعلیت حیاتی توانائی کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے جاری رہتی ہے۔ اور ہم اس کے طفیل کچھ تو خارجی دنیا اور اس کی اشیاء سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اور کچھ ہم اُن پر ذاتی اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ ہماری فعلیت مقصدی اور

طلبی ہے۔ اسلئے ہم ان اشیاء میں ایسی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے مفید مطلب بن جائیں۔

یاد رہے کہ فعلیت میں عضوی اور شعوری حرکات دونو کے معنی شامل ہیں۔ لیکن ہم اپنے بحث کی خاطر صرف اس کی شعوری معنی کو اختیار کرینگے۔

ہر فعلیت میں شعور کے تین اجزائے بسیط (MODES) ۱ وقوف ۲ احساس ۳ ارادت یا طلب غیر جداگانہ طور سے شامل کار ہوتے ہیں۔ پہلے جزو یا شؤن کے باعث ہمیں خارجی دنیا، بیرونی اشیاء اور ان کے درمیان کے تعلقات کا علم ہوتا ہے۔ اور دوسرے جزو کے باعث ہمیں اُن کی لذت یا الم کا احساس ہوتا ہے۔ اور تیسرے کے باعث ہمیں اس لذت کے جاری رکھنے یا اس الم (درد) سے گریز کرنیکا رجحان ہوتا ہے۔ کسی فعلیت میں بھی مندرجہ بالا تینوں مفردات شعور (MODES) یکساں اور مساوی نہیں پائے جاتے۔ اور نہ ہی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں بلکہ فعلیت کی وحدانیت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بعض فعلیتوں میں وقوف کا غلبہ ہوتا ہے۔ بعض میں احساس کا اور بعض میں ارادت یا طلب کا۔

زندگی میں جب ہم اپنی فعلیت کے باعث اپنے ماحول سے متأثر ہوتے ہیں۔ یا اپنے ماحول پر اثر ڈالتے ہیں۔ تو ہر آن اس ماحول اور تبادلۂ اثرات کیمطابق ہماری شعوری فعلیت اور تجربہ کے ایک یا دوسرے مفرد یا پہلو کی نشو ونما ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہمارے ماحول میں عقلیہ جزو کا پلّہ بھاری ہے۔ تو ہماری فعلیت کے وقوفی پہلو کی ترقی ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عقلی حاسہ یا عقلی ذوق نشوونما پاتا ہے۔ اور اگر ہمارے ماحول میں احساسی پہلو کا غلبہ ہوتا ہے تو اس

وقت ہماری شعور فعلیت کا احساسی پہلو ترقی کرتا ہؤا اس کے مطابق ہمارا جمالی حاسہ نشو ونما پاتا ہے۔ اور اگر ارادت کا غلبہ ہے۔ تو اس حالت میں اخلاقی حاسّہ ترقی کرتا ہے۔

انسان کے ماحول میں نہ صرف جاندار اور بے جان اشیار شامل ہیں۔ بلکہ تمام وہ مستند اصول اور نتائج شامل ہیں۔ جو انسان کے نسلی تجربہ کی بنا پر مفید ثابت ہو کر مختلف انسانی شعبوں اور اداروں میں رائج ہیں۔ یعنی انسان کا ماحول علاوہ جاندار اور بے جان اشیار کی قومی تمدّن۔ مذاہب رواج۔ مستند علوم اور سوسائٹی پر مشتمل ہے۔

اب انفرادی حیثیت میں انسان اپنے ماحول کے متعلق کچھ تو گھر، مدرسہ اور مسجد کی براہ راست تعلیم کے ذریعے اور کچھ عام تلمیح کے ذریعے اپنی فعلیت کی وساطت سے علم حاصل کرتا ہے۔ اور وہ علم یادداشت کے باعث اس کے ذہن میں نہ صرف جاگزیں رہتا ہے۔ بلکہ زندگی کے اجرا کے ساتھ ساتھ کچھ تو آیندہ فعلیت پر اثر ڈالتا رہتا ہے۔ اور کچھ اس کے باعث خود بخود ترمیم پاتا رہتا ہے۔ اسی طرح سے ماضی حال میں جاری رہتی ہے۔ اور حال کی فعلیت ماضی کے تجربات کی جمعیت کی ترمیم کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی تخلیقی نشو ونما پاتی ہے۔

یہ تو ہم نے دیکھ لیا ہے۔ کہ کسطرح کسی ذات کی ماضی اس کے حال میں جاری رہ کر اس کی توسیع کرتی ہے۔ لیکن حال کی فعلیت کے عواقب مستقبل میں ہوتے ہیں۔ اسلئے ہماری نظر مستقبل پر بھی رہتی ہے۔ ویسے بھی جیسے اوپر کہا جا چکا ہے۔ کہ فعلیت طلبی یا مقصدی ہوتی ہے۔ گو فعلیت حال میں جاری رہتی ہے۔ تاہم اسکے

طلبی یا مقصدی ہونے کے باعث مستقبل میں استمرار رکھنے کا رجحان رکھتی ہے۔
اب سوال یہ ہے۔ کہ کونسی ایسی چیز ہے؟ جسکی طلب میں ماضی حال میں توسیع پاتے ہوئے مستقبل میں استمرار رکھنے کے لئے بیقرار ہے۔ اس سوال کے جواب میں مختلف زمانوں میں مختلف ماہرین فلسفہ اور خاصکر ماہرین اخلاقیات نے مختلف نظریے پیش کئے ہیں لیکن ہمیں ان سے فی الحال واسطہ نہیں۔ ہم صرف وہ نظریہ پیش کرینگے جو کہ مابعد الطبعیات اور نفسیات پر مبنی ہے۔ اور وہ ہے تکمیل ذات یا حصول ذات۔

زندگی کی رد کی اجزاء میں ماحول کے مطابق ہر ایک فرد عاطفۂ فوق الذات کے زیر اثر رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کے نصب العین کا اکتساب کرتا رہتا ہے۔ اور جس طرح سے فعلیت کے عواقب کیلئے مستقبل کا انتظار رہتا ہے۔ اسی طرح سے زندگی کے جد و جہد کے عواقب کی جھلک بھی مستقبل میں ہوتی ہے۔ اور جس طرح سے ہر فعلیت میں ذات کی نشوونما مضمر ہے۔ اسیطرح سے زندگی میں بھی ذات کے حصول کا راز مضمر ہے لیکن ذات کا حصول حال میں کلیتہً نہیں ہوتا۔ یعنی صرف اضافی طور سے ہوتا ہے۔ اور اس کا بڑا حصہ مستقبل میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک فرد کے لئے اس کی اصلی ذات کا تصور مستقبل میں بندھ جاتا ہے۔ اور وہ اس کے حصول کی غرض سے ماحول میں ماحول کے مطابق جد و جہد جاری رکھتا ہے۔

نصب العین کی خصوصیات

i ۔ کسی فرد کا نصب العین اس کی ذاتِ اصلی کا آئینہ ہوتا ہے۔ جسکا مستقر مستقبل ہے۔

ii ۔ نصب العین گو زیادہ تر اکتسابی ہے۔ لیکن بہت کچھ فرد کی جدت اور تخلیقی تخیل پر انحصار رکھتا ہے۔

iii - جس طرح سے خوبی اور ثواب کیلئے کوئی مقررہ حد نہیں۔ اسی طرح سے جتنا کوئی فرد اپنے نصب العین کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اتنا ہی اس سے دور جا پڑتا ہے۔ کیونکہ قطعی تکمیل اس دنیائے فانی میں قطعی ناممکن ہے۔ بلکہ اس دنیا میں تو کسی شے کا وجود قطعی طور پر نہیں۔ بلکہ ہر ایک شے اضافی ہے۔ ہم نیک سے نیک کام کر سکتے ہیں لیکن بالکل اور قطعی طور پر نیک عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح سے حصولِ ذات یا تکمیل ذات قطعی طور پر دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

iv - نصب العین صرف عالم تخیل میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیں اسکا یقین ہوتا ہے۔

v - اس کا تصور ہمارے ذہن کے سامنے بالکل صاف نہیں ہوتا۔ کیونکہ مستقبل کے شک کے زیر اثر رہتا ہے۔

vi - گو اس کا تصور اور اس کی نشو و نما ہمارے ماحول کے مطابق زندگی کی اجزائے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ تاہم جبکہ اس کا کسی قدر معین نقشہ ہمارے ذہن کے سامنے بندھ جاتا ہے۔ تو ہمارے جدوجہد کو ابھارتا اور اکساتا (INSPIRE کرتا) رہتا ہے۔

ہر فعلیت ذات کا خارجی مظہر ہے۔ اور ہر فعل کے ساتھ ذات اپنے تئیں منسوب کرتی ہے۔ اور ہر فعل میں ذات اس بات کی جدوجہد رکھتی ہے۔ کہ جو کچھ وہ اب ہے۔ آئندہ نہ ہو۔ بلکہ وہ (تصوری ذات Ideal Self) ہو۔ جسکا تصور کچھ تو اس نے اپنے ماحول سے اکتساب کیا ہے۔ اور کچھ تخلیقی تخیل کے باعث بنا چکا ہے۔ اب اگر کسی فرد کا ماحول خالص علمی ہے۔ تو اسکا عقلی حاسہ نشو و نما پاتا

ہے۔ اور اس کے علمی مذاق کی ترقی ہوتی ہے۔ اور اس مخصوص مذاق کے مطابق اسکے نصب العین میں عالم و فاضل کے تصور کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور جیسے اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ کہ ہر فعلیت میں نفس کے ہر سہ شیئون شامل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسرا غالب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگرچہ کسی فرد کا ذوق خالص علمی ہوتا ہے تاہم اس میں دوسرے حسا سے مفقود نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ بھی اس مخصوص ذوق کے ممد ہوتے ہیں بالفرض کسی شخص کی خواہش ہے۔ کہ وہ ایک اعلےٰ درجے کا عالم اور فاضل بن جائے تو اسوقت اسکا یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ اسکی مستقبل کی ذات ایسی ہو۔ جو علمی دنیا میں کچھ پیدا کرے۔ وہ نہ صرف علمی خوبیوں سے پیراستہ ہو۔ بلکہ جمالیات اور اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے بھی بالکل بے قصور ہو۔ اپنے نصب العین کے تصور میں وہ اپنی ذات کو ایسا فاضل متصور کرتا ہے جس کی تحریر و تقریر نہ صرف علمی نقطۂ نگاہ سے اعلیٰ ہو۔ بلکہ جمالی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی امتیاز رکھتی ہوں۔ وہ نہ صرف اپنے خیالات اور اقوال کے لحاظ سے اپنی ذات کو اعلیٰ متصور کرتا ہے۔ بلکہ چاہتا ہے۔ کہ اس کا خارجی جسم بھی ایسا ہو۔ کہ اس کی حرکات و سکنات تمام اس کی ذات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہوں اور جو کچھ وہ علمی دنیا میں پیدا کرے۔ صرف اس کی ذات کی طرف منسوب ہو سکے۔

علمی نصب العین پر یہاں اس لئے کافی بحث کی گئی۔ کہ یہ مضمون خاص طور پر مدرسین کے فائدہ کیلئے لکھا جاتا ہے۔ چونکہ مدرسین کا ماحول اور پیشہ علمی ہے۔ اسلئے اُن میں سے اکثر کا نصب العین لازماً عالم بننا ہے۔

عِلمی نصب العین کے خواص

علم کا تعلق حقائق سے ہے۔ اسلئے وہ لوگ جو حصول علم کیلئے بیقرار ہیں۔ وہ ہر بات اور

سرامر کی حقیقت کے طلبگار ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ تلاش حق میں منہمک ہوتے ہیں سطحی باتوں سے انکا سروکار نہیں ہوا کرتا۔ اور جس طرح ایک انگریز شاعر کیٹس (KEATS) اپنی مشہور نظم (Ode to Nightingale) میں لکھتے ہیں کہ حق جمال ہے اور جمال حق ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی ہر بات میں نہ صرف حقیقت ہوتی ہے۔ بلکہ وہ خوبصورتی اور جمال بھی پایا جاتا ہے۔ جو حقیقت کیلئے لازم ہے۔ حقیقت کا دنیا میں ایک جمالی رعب ہوتا ہے۔ اور اس کیلئے اس قسم کے لوگوں کی باتیں قابل قبول ہوتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے عالم اور فاضل کا۔ وسائٹی (معاشرہ) میں حق گوئی کے باعث ایک خاص جمالی رعب یا پیار طاری رہتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے۔ حقیقت کے باعث ہی سے خود بخود ایک خاص جمالی شکل میں ادا ہوتا ہے۔ اور اس کا ہر ایک دل پر اثر ہوتا ہے۔ جتنا کوئی علم میں ترقی کرتا ہے۔ اتنا ہی اُس کو اپنی بے علمی کا اندازہ ہوتا جاتا ہے۔ اسلئے علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود منکسر المزاج بنتا جاتا ہے۔ اور کچھ تو تلاشِ حق اور کچھ اپنی بے علمی کے [illegible] کے احساس کی وجہ سے ان میں ایک خاص قسم کی جمالی معصومیت بھی پیدا ہوتی جاتی اب ہر ایک حقیقی عالم ان خواص کی ترقی دینے میں کوشاں رہتا ہے۔ اور صدق دل سے چاہتا ہے۔ کہ مستقبل میں اس کی ذات کے اندر تمام مندرجہ بالا خوبیاں [illegible] معنوں میں پائی جائیں۔ یعنی اس کی ذات تمام مندرجہ بالا خوبیوں کا مجسمہ ہو (گو نصب العین کی جسمیت نہیں ہوتی۔ یہ صرف تصوری ہے)

چنانچہ اس کا نصب العین ایسی ذات پر مشتمل ہوگا۔ کہ

i ۔ وہ پیوستہ حصول علم کی جستجو میں منہمک ہو۔

ii ۔ دنیا کے لئے نئی سے نئی حقیقت کا انکشاف کیا کرے

iii۔ انسانی علم کے حدود کو دیکھتے ہوئے نمائشی دعووں سے تہی ہو۔ اور عاجزی۔ ملنساری اور انکساری کا مجسمہ ہو۔

iiii۔ حق گوئی کے ساتھ ساتھ معصومیت کا مجسمہ ہو۔

اب پڑھنے والا خود دل میں سوچے۔ کہ اس نے اپنی زندگی میں کونسا اور کس قسم کا نصب العین اپنے لئے بنا رکھا ہے۔ اور غور سے دیکھے۔ کہ آیا کوئی نصب العین اسکے ذہن کے سامنے موجود بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو اس کی تحلیل کر کے دیکھے۔ اور مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں اس پر غور کرے۔ اور اگر اس کے ذہن میں کسی قسم کا تصور نہیں۔ تو اسکی خوبیوں پر غور کرتے ہوئے اپنے لئے ایک خاص نصب العین بنا لے کیونکہ نصب العین کے حصول کی جدوجہد ہی میں ہماری زندگی کے تمام انفرادی اور نسبتاً جداگانہ افعال خود بخود انضباط اور ان کی تنظیم قائم ہوتی ہے۔ اور وہ سب کے سب خود بخود ایک سلسلے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اور خود بخود ہی موزوں اور مناسب محل کے مطابق اس سلسلے میں پروئے جاتے ہیں جس سے آخرکار حصولِ ذات یا نصب العین تک پہنچنا مقصود ہوتا ہے۔

فضیل ہادی

وہی ہے صاحبِ امروز جسنے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

اقبال

موجودہ ہندوستانی بچّے کی اخلاقی پستی اور اسکی ذمّہ داری

(۱)

آج کل ہندوستان کے طول وعرض سے یہ پکار اُٹھ رہی ہے۔ کہ موجودہ زمانے میں بچے اخلاقی لحاظ سے بالکل کورے ہیں۔ ان میں اعلیٰ انسانی صفات مثلاً تابعداری محبّت رواداری وغیرہ بالکل مفقود ہیں۔ رہنمایانِ ملک و قوم اور عام پبلک اس کو بُری طرح سے محسوس کرتی ہے۔ مگر اس احساس کے باوجود اس کی اصلیت کی تلاش بہت ہی کم کی گئی ہے۔ نتائج کبھی واقعات کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ اسلئے اسی نقطۂ نظر کے ماتحت اس سوال پر غور کرتے ہیں۔

یہ حالت بچوں کی غلط تربیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اور بچوں کی تربیت کا انحصار تین چیزوں پر ہے۔

(۱) والدین

(۲) ماحول

(۳) اُستاد

اب میں ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ بحث کرونگا۔ کہ کس طرح ان میں سے ہر ایک نے موجودہ بچے کو اس اخلاقی پستی میں دھکیل دیا۔ سب سے پہلے میں والدین کو لیتا ہوں۔

ہندوستان میں والدین بچے کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ کیونکہ ان کے خیال میں بچہ جب تک کم عمر ہے۔ کمزور و ناتوان ہے۔ اسوقت اس کو دنیاوی کاروبار سے کچھ تعلق نہیں

اس کا کام صرف کھانا پینا اور کھیلنا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کے ماتحت بچے کے کھانے میں بد پرہیزی برتی جاتی ہے۔ اس کے لباس میں اسراف کیا جاتا ہے۔ اور اس کی کھیل ہر ایک بندش سے آزاد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے۔ اسکو ضبط میں لانا مشکل ہو جاتا ہے پھر والدین کو احساس ہوتا ہے۔ کہ یہ بچہ بڑا ضدی سنا فرمانبردار ہے۔ کسی کے کہے سننے میں نہیں۔ مگر اس تلخ تجربے کے باوجود ان کا رویہ وہی رہتا ہے۔

ہندوستانی والدین اکثر تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور اگر تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ تو بھی وہ بچوں کے متعلق کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ بچہ انکے سامنے ناموزوں الفاظ استعمال کرتا ہے۔ نامناسب حرکات اُس سے سرزد ہوتی ہیں۔ وہ ان کے بال نوچتا ہے۔ ڈاڑھی کھینچتا ہے۔ ناقابل حصول اشیاء کی خواہش کرتا ہے۔ بڑوں چھوٹوں سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ گالیاں نکالتا ہے۔ ہر ایک قسم کی گستاخی بے باکانہ کرتا ہے۔ مگر والدین "بچہ ہے" کہہ کر اس کے ان تمام عیوب کی نہ صرف پردہ پوشی کر دیتے ہیں۔ بلکہ اس پر پیار اور محبت کیساتھ پسندیدگی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ بچّہ کی تمام حرکات جبلّی خواہشات کی تکمیل کے سلسلے میں ہوتی ہیں۔ اور ہر ایک جبلّی خواہش اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کو جسطرح چاہے استعمال کیا جاوے۔

انسان کا باقی حیوانات پر جو شرف ہے۔ وہ صرف انہی خواہشات کے مناسب استعمال میں ہے۔ انسان وہی ہے جس نے حیوانیت اور حیوانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیا ہو یا اُن کو ایسی تربیت دی ہو۔ کہ وہ صرف بنی نوع انسان کی بہتری میں ہی استعمال ہوں۔ اور اُن کے صحیح استعمال سے انسانی سوسائٹی کو اپنے ارتقا میں امداد دے۔

والدین کی اس جہالت کی ذمہ داری صرف اُن پر ہی نہیں۔ بلکہ اُن کے والدین پر

بھی ہے۔جنہوں نے رواجاً شادی تو کردی۔مگر اُن کو یہ نہ بتایا۔کہ شادی کے بعد اُن پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہونگی۔اگر وہ انہیں صحیح طور پر تربیت دیتے۔تو کوئی وجہ نہ تھی۔کہ آج کے بچے اس حالت میں ہوتے۔میرے خیال میں اگر کسی کو شادی کے بعد کی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کرا دیا جائے۔تو مجھے یقین ہے کہ کوئی فرد بشر اس وقت شادی کیلئے تیار نہ ہوگا۔جب تک وہ اپنے آپ میں اس کام کی اہلیت نہ دیکھیگا۔

خواہشات کی تکمیل کرنا اور بچہ پیدا کرنا محض حیوانی افعال ہیں۔انسان نے تو اس ہزاروں برس کے ارتقا میں ان میں بہت سی ترقی کرلی ہے۔انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کی پرورش کو حیوانات کی طرح اتفاقات پر نہ چھوڑے۔اب اگر بچہ کی تربیت کے کام کا مقابلہ انسان کے دوسرے کاروبار سے کیا جائے، تو وہ سب تربیت اولاد کے مقابلے میں کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔

یہی وجوہات ہیں،کہ اکثر والدین کو اس بات کا احساس ہی نہیں۔کہ بچے ہی وہ مواد ہیں۔جن سے آئیندہ زمانہ کی برائی یا بھلائی کی تعمیر ہوگی۔اگر بچے کو درست تربیت دی جائے۔تو بڑا ہو کر اس کا صراطِ مستقیم سے بھٹکنا ناممکن ہے۔اگر بچے کو منشیات سے پرہیز کرنا سکھا دیا جائے۔تو شرابیوں اور عیش پسندوں کا نام اس دنیا سے مٹ جائے! اگر بچے کو بڑوں کی تعظیم اور ادب کرنے کی عادت ڈال دی جاوے۔ تو بے غیرتی اور بے حیائی کا نام و نشان اس جہان میں نہ رہے! اگر بچے کی ضبطِ نفس کی تربیت کی جاوے۔تو تمام خرابیوں کا امکان ہی اٹھ جائے!

اس میں شک نہیں کہ علمی طور پر ایسا ہونا ذرا دشوار ہے۔مگر عمل سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔اب اگر آپ اپنے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے بچوں کا غور سے

مطالعہ کریں۔ توآپ کو فوراً محسوس ہوجائیگا۔ کہ ہم اور ہمارے عزیز اور دوست اپنے بچوں کے مستقبل سے بالکل غافل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے بچے بالکل خام ہیں۔ ناتجربہ کار ہیں۔ مگر اس کے باوجود اُن کو پختہ کار بنانے کے لئے کچھ سعی نہیں کرتے۔ ہم نے اس بات پر بالکل غور ہی نہیں کیا۔ کہ یہی بچے ایک دن آئندہ دنیا کے کاروبار کو چلانے والے ہونگے۔ اور اس کے بگاڑنے یا سنوارنے کا موجب بنیں گے۔ اور ان ہی بچوں کے ساتھ آئندہ زمانہ کی تباہی یا خوشحالی وابستہ ہے۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں۔ کہ موجودہ اخلاقی پستی کی ذمہ داری کہانتک والدین کے سر پر ہے۔ (باقی آئندہ)

محمد سلیمان

ورزشِ جسمانی

قوم کا بچاؤ اس بات پر موقوف ہے۔ کہ صحت کے قواعد وقوانین پر عمل کرنے میں شخصی کوشش کی جائے۔ جو شخص اپنے جسم اور گھر کے متعلق علم صحت کے چھوٹے چھوٹے قواعد پر بخوبی عامل ہے۔ اپنے ان ابنائے جنس کی "علمی" کے سبب ہر وقت معرض خطر میں ہے۔ جو ان احتیاطوں کو نظرانداز کرتے ہیں۔

مرسلہ غلام نبی ڈرل ماسٹر

ہماری کائنات

"ہماری کائنات" سے میری مراد نجمی کائنات سے ہے۔ جسمیں نہ صرف چاند۔ سورج۔ زمین اور تقریبًا تمام وہ اجرام فلکی شامل ہیں۔ جودات کو خواہ وہ برہنہ آنکھ سے دکھائی دیں یا مسلح آنکھ سے[1]۔ بلکہ تمام اُس مکان یا فضائے عالم سے بھی ہے۔ جس کے اندر یہ تمام اجرام فلکی واقع ہیں۔ اور جس کا بیشتر حصہ خالی پڑا ہے۔ (یہ خالی از وجودات حصہ کسقدر ہے؟ اور تارے ایک دوسرے سے کس قدر الگ تھلگ پڑے ہیں؟ آیندہ اقساط میں بتایا جائیگا۔) اس نجمی کائنات کا صحیح تصور مکمل طور پر انسانی گھمنڈ کا قلع قمع کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانی دماغ کی طاقت اور اسکی رفعت پرواز کا صحیح اندازہ بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

انسان ہمیشہ سے کائنات کی واقفیت بلحاظ مکان و زمان حاصل کرنیکی کوشش کرتا رہا ہے۔ کیونکہ وہ خود کائنات کا ایک جزو ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کہ ہم سے پہلے کیا تھا؟ اور بعد میں کیا ہوگا؟ اور کہ ہم کائنات میں کہاں پر کھڑے ہیں؟ ایسے علم کے بغیر خود شناسی ناممکن ہے خود شناسی کیلئے کائنات شناسی اشد ضروری ہے کیونکہ ہر قسم کے علم کا واحد دروازہ حواس خمسہ کا نظام ہے۔ اور حواس خمسہ کے تمام ارتسامات[2] حواس خمسہ اور ہمارے ماحول یعنی کائنات کے درمیان عمل اور ردعمل[3] سے حاصل ہوتے ہیں۔

---

[1] جبکہ آنکھ دوربین میں سے دیکھ رہی ہو۔ [2] Impressions of [3] Action and Reaction

"ہماری کائنات" کا موضوع جتنا کہ وسیع ہے۔ اتنا ہی دلچسپ اہم اور پیچیدہ مسائل سے مَس کرتا ہے۔ اس موضوع میں زمین۔ چاند۔ سورج اور تاروں کی ماہیت جسامت ان کی پیدائش۔ عمر اور موت جیسے حیرت انگیز اور جاذب تخیل بحث و مباحثوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن کا مطالعہ نہایت ہی سربستہ اسرار اور دقیق حقایق سے بھرپور ہے اور جنکی بے نقابی میں جدید سائنس نے بہت حد تک کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اِس تحصیل علم میں انسان نے جس فہم و ذکا۔ اختراع۔ اور محنت و استقلال کا استعمال کیا ہے۔ وہ اس کی اشرف المخلوقات ہونیکا بیّن ثبوت ہے۔

"ہماری کائنات" کا ذکر میں اپنے گھر یعنی زمین کے سرسری ذکر سے شروع کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اپنے گھر اور اپنے علاقے کی واقفیت جغرافیہ عالم کی واقفیت سے مقدم ہے۔

زمین اور غایتِ تخلیق کائنات

متقدّمین کا خیال تھا۔ کہ زمین کائنات کا مرکز ہے۔ کائنات اہل زمین یعنی انسان کیلئے پیدا ہوئی۔ کائنات میں تمام اجرام فلکی انسان کے مفاد کیلئے ظہور پذیر ہوئے ہیں اس کی تخلیق سے لیکر انسان کی پیدائش تک اجرام فلکی نے جتنے ارتقائی مرحلے طے کئے ہیں۔ وہ سب کے سب اس لئے کہ ان کی آخری حالت انسانی زندگی کے موافق بن جائے۔ اور انسان کو ان سے ہر قسم کی امداد۔ آرام و آسایش ملے کائنات کی تعمیر سے گو ایک بڑی ارادت کا اشارہ ضرور ملتا ہے۔ جیسے کہ قارئین کرام کو کائنات کا ذکر پڑھنے سے آہستہ آہستہ محسوس ہوگا۔ لیکن انسان نے مندرجہ بالا خیال کے اظہار کرنے میں اپنی ہستی کو حد سے زیادہ وقعت دی ہے

یہ تعصب شاید اس کی فطرت میں غیر شعوری طور پر موجود ہے۔ نیز انہیں اس وقت نہ تو اپنی زمین کی حیثیت کا پتہ تھا۔ اور نہ دیگر ارکان کائنات کا۔ لیکن جب ہم جدید سائنس کے انکشافات کی روشنی میں اس مسئلے کو دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں اُن سے اتفاق کرنے میں بہت مشکل درپیش ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کی عمروں سے زمین کی عمر کا مقابلہ کرتے وقت زمین کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

زمین کی عمر

زمین پر بعض ایسی اشیاء پائی جاتی ہیں۔ جنہیں وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ آج تک ان میں جسقدر تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اس کے دقیق مشاہدے سے زمین کی عمر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین کی عمر دو ارب سال[1] سے کچھ زائد ہے۔ یعنی ارب سال سے پہلے ہماری زمین کا وجود نہ تھا۔ لیکن اس سے قرنہا قرن پہلے کائنات موجود تھی۔ آسمان میں لاتعداد جگمگاتے ہوئے انجم جلوہ گر تھے۔ ان کو "تعلیم تابندگی" مل چکی تھی۔ گنبد فلک میں آج کل کی سی محفل چراغاں بھی ہوئی تھی۔ گو چراغوں کی چمک نسبتاً ذرا سی تیز تھی۔ مگر اس دلکش سمے پر ابھی تک چشم شاعر نہیں پڑی تھی۔ آفتاب بدستور گرم ضیاپاشی تھا۔ گو اس کو "یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز" کہلانے کا فخر حاصل نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے فیض و کرم سے کوئی پجاری مستفید نہیں ہوا تھا۔ یعنی کہ اس کے حضور میں ابھی تک کوئی سجدہ میں نہ گرا تھا۔ اور نہ اُسے "روح روانِ جہان" کا لقب ملا تھا۔ کیونکہ ابھی تک ارضی زندگی کی کلی بھی نہیں پھوٹی تھی۔ کلی کا پھوٹنا تو درکنار نخل حیات کے لئے زمین بھی نہ تھی۔ لیکن جیسا کہ بتا چکا ہوں۔

---

[1] اصل میں اس وقت سال تھا بھی نہیں۔ کیونکہ سال اس عرصہ کا نام ہے جس میں زمین سورج کے گرد ایک چکر پورا کرتی ہے۔

کائنات میں سورج اور ستارے اپنی اپنی شوکت وعظمت سے چمک رہے تھے۔ یہ حالت قریباً ازل سے طاری تھی۔ لیکن کس لئے؟ کیا اتنے بعیدازفہم عرصے سے جو ستارے آسمان میں جشن چراغاں منا رہے تھے۔ تو صرف اس لئے کہ ہماری زمین کے پیدا ہونے اور پھر زمین کو حامل زندگی ہونے کے بعد جب اس پر کا بنی آدم سمندری سفر کریگا۔ تو اِن سے اُسے جہازرانی میں مدد ملیگی؟ یا اس کے شب تاریک کی ظُلمت کو قدرے کم کرنا ان کی غرض وغایت تھی؟ ستاروں کے عمر کے مقابلے میں تو زمین طفل نوزائیدہ ہے۔ اُسے تو چند ہی لمحے ہوئے کہ پیدا ہوئی اور نسبتاً چند ہی لمحوں کے بعد خاموش ہو جائے گی۔ جب کہ ستارے اُسی عظمت اور اُسی شوکت سے چمک رہے ہوں گے۔ اور آسمان کی زیب وزینت میں کچھ فرق نہ پڑا ہوگا۔

مندرجہ بالا سوالات کو کو قارئین کے غور وفکر کیلئے چھوڑ کر میں اپنے موضوع کی طرف آنے کی یعنی زمین کی سطحی واقفیت دلانیکی کوشش کروں گا۔

زمین کے اس وقت کیا مشاغل ہیں؟ اس کے پڑوس میں کون کون آباد ہیں؟ زمین کیسے پیدا ہوئی؟ وقت ولادت اس کی کیا حالت تھی؟ موجودہ حالت میں پہنچنے تک اس نے کون کون سے ارتقائی مرحلے طے کئے؟ اس پر زندگی کی کلی کب پھوٹی؟ حیات فے الارض میں کیا کیا ارتقائی تبدیلیاں ہوئیں؟ اور آئندہ اس کا اور اس پر کی زندگی کا کیا حشر ہوگا؟ ان تمام مسائل کے متعلقہ انکشافات کا سرسری طور پر بیان کرنا مدنظر ہے۔

ایک نعمتِ عظمےٰ اہل زمین کو فلکیات کے علم کے علاوہ زمین کے

متعلق بھی کافی علم اجرام فلک کے مشاہدے سے حاصل ہوا ہے۔ لیکن ان علوم صفوء گنبد فلک سے پڑھتے وقت انہیں اکثر اوقات ایک بڑی نعمت عامہ جو انہیں اس ارضی زندگی میں میسر ہے کا احساس نہیں ہوا کرتا۔ ہم لوگ بڑے خوش قسمت ہیں۔ کہ ہماری زمین کا کرۂ ہوائی شیشے کی طرح شفاف ہے۔ اس میں سے ہم آسمان کی زیب وزینت ستاروں کا تنگ دور۔ اور ایک وسیع دنیا دیکھ سکتے ہیں۔ اور نظام قدرت کے قواعد وضوابط کے مشاہدات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ اگر ہمارا مسکن کسی ایسی زمین (مثلاً مشتری یا زہرہ) پر ہوتا۔ جس پر کہ دائمی تاریک گھٹاؤں سے انسانی دید پار نہ گذر سکتی۔ تو ہم نہ صرف آسمان کے منظر سے لطف اندوز نہ ہو سکتے۔ بلکہ کائنات کی وسعت اور فلکیات کے سنسنی خیز اسرار و دقیق حقائق کے علم سے بھی محروم و ناآشنا رہتے۔ کوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے مختصر سے کوئیں کو بحر بے پایاں کہتے۔ ہمارے کرۂ ہوائی کی دلچسپ سحر کاریاں جن کے عمل سے صبح وشام کی بدلیوں کو زرق برق کی پوشاکیں پہننے کو ملتی ہیں۔ اور طلوع و غروب کے وقت مہر کو "تاج زر" کا عطیہ ملا کرتا ہے۔ آیندہ جاکر چاند کے سفر کے دوران میں بیان کی جائینگی۔

آسمان کا مشاہدہ

ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ آسمان پر کے جگمگاتے ہوئے چراغ حرکت میں ہیں۔ ساعت مشاہدہ کے ٹھیک چوبیس گھنٹوں کے بعد وہ دوبارہ اپنی پہلی جگہ پر دکھائی دیتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر گنبد آسمان چکر کھا رہا ہے۔ اور اس کو ایک چکر کی تکمیل میں چوبیس گھنٹے لگتے ہیں۔

اس حرکت کو دیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ آسمان کے سامنے کیمرہ رکھکر تاروں کو موقع دیا جائے۔ کہ وہ خود اپنی حرکت کی تصویر فوٹو کے شیشے پر چھوڑ جائیں۔ ایسی تصویر کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ تارے مختلف گول دائروں میں زمین کے گرد چکر کھاتے ہیں۔ آسمان پران دائروں کا مرکز قطبی ستارہ ہے۔ قطبی ستارہ کیوں آسمان کے اس ظاہری گردش میں حصہ نہیں لے رہا۔ یہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔

روزانہ گردش فلک کو دیکھ کر اکثر متقدمین کے دماغوں میں طبعًا یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ تارے کرۂ آسمان سے بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن مختلف فاصلوں پر۔ اور اس لئے گنبدِ آسمان کے ساتھ ساتھ زمین کے گرد اپنے اپنے دائروں میں گردش کرتے ہیں ان کے اس خیال غلط سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اور وہ یہ کہ انہیں مجبورًا زمین کو گول ماننا پڑا کیونکہ اس یقین کے بغیر انہیں دن رات کا نظام سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ سوچتے تھے۔ کہ آخر دن اور رات کیوں ہوتے ہیں؟ دن اور رات کے سلسلہ کی صرف ایک ہی وجہ اُن کی سمجھ میں آسکتی تھی۔ (کیونکہ زمین کی محوری گردش کے بجائے وہ آسمان کی گردش مانتے تھے) اور وہ یہ کہ گول زمین ہی کے گرد آسمان اور اُس کے ساتھ بندھا ہوا سورج طواف کرتا ہے۔ جس سے روزانہ طلوع اور غروبِ آفتاب ہوتا رہتا ہے (قارئین کرام کو زمین کے گول ہونے کے دیگر باصحت اثباتِ ارضی وسماوی معلوم ہوں گے)

نوٹ مثلاً چاند گرہن کے وقت چاند پر کا سایہ گول ہوتا ہے۔ اور چاند گرہن کے اوقات کی صحیح پیشین گوئی تب کی جاسکتی ہے۔ جب یہ سایہ زمین کا سایہ مان لیا جاوے۔

زمین کے گول ماننے سے جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارا گول زمین پر قائم رہ سکنا۔ سمندروں کے پانی کا ٹھیرے رہنا۔ یعنی ایک طرف کو بہہ کر نہ نکلنا۔ کرہ ہوائی کا زمین سے بھاگ کر الگ نہ ہو سکنا۔ وغیرہ ایسے امور ہیں۔ جو سکول کے بچوں کے ننھے ننھے دماغوں میں آسانی سے نہیں بیٹھ سکتے۔

یہ تمام مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گے۔ جب قارئین کرام کو آگے چل کر زمین کی ولادت سمجھانے کی خاطر مادے کی اس خاصیت کا ذکر کیا جاوے گا۔ جسکی بدولت مادی اشیاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن کو سائنس کی اصطلاح میں "تجاذب"[۱] کہتے ہیں۔

کائنات کی ساخت کا مندرجہ بالا نظریہ جسے ہم "نظام بطلیموسی" کہتے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار سال رہا اس کے بعد پولینڈ کے ایک فلاسفر کاپرنیکس (۱۴۷۳-۱۵۴۳) نامی نے اس کو غلط ثابت کر کے موجودہ علم ہیئت کی بنیاد ڈالی۔

زمین کی محوری و طوافی گردش

سب کو معلوم ہے۔ کہ آسمان پر ستاروں کی ترتیب ایک رہتی ہے۔ ستارے اپنے محل وقوع نہیں بدلتے۔ چنانچہ آسمان پر کئی ایک ستارے ہمیشہ سے ایک دوسرے کی رفاقت میں رہتے آئے ہیں۔ ستاروں کے اس قسم کے گروہ[۲] (مثلاً دبِ الاکبر۔ دبِ الاصغر۔ ثریا۔ ذات الکرسی۔ نسر الاعظم وغیرہ) ہم بچپن سے دیکھتے آئے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ستارہ اپنی ٹولی کو چھوڑ کر دور نہیں نکل جاتا۔ ایسے ستاروں کو جو اپنی جگہوں پر قائم رہتے ہیں۔ "ثابت[۳] ستارے" کہتے ہیں۔

---

۱ Gravitation ۲ Constellations یا صورتہائے سماوی

۳ Fixed Stars حقیقت میں یہ بھی حرکت میں ہیں۔ لیکن چونکہ ہم سے دور دراز فاصلے پر واقع ہیں۔ اسلئے ہماری عمر میں انکی جگہوں میں اسقدر تبدیلی بھی نہیں دکھائی دیتی کہ ہم انہیں محسوس کر سکیں۔

لیکن برعکس ان کے چند اجرام فلکی ایسے ہیں۔ جو آسمان میں اپنے محلات بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ تاروں کے ایک جھنڈ یا اجتماع کے نزدیک دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی دوسرے کے ساتھ۔ یہ ثابت ستاروں سے زیادہ روشن بھی ہیں۔ ایسے "خانہ بدوش" اجسام فلکی کو "سیارے" کہتے ہیں۔ قدماء کا علم ہیئت سیاروں[1] کی حرکت دیکھنے تک محدود تھا۔ خانہ بدوش اجسام میں سے صرف چاند اور سورج ایسے تھے۔ جن کی حرکت دیگر سیاروں سے نہیں ملتی تھی۔ فضا میں اُن باقی سیاروں کی عجیب گامزنی کے مشاہدات سے کاپرنیکس اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ یہ سیارے زمین کے گرد نہیں۔ سورج کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت سے زمین کا "مرکزی وقار" گر گیا ہے۔ اس نے زمین کی حقیقت کو بھی معلوم کیا۔ کہ یہ بھی ایک سیارہ ہے۔ جو سورج کے گرد سال میں ایک مرتبہ چکر لگاتا ہے۔ چونکہ ان دنوں یہ معلوم تھا۔ کہ سورج زمین سے بہت دور واقع ہے۔ اس لئے اگر زمین سورج کے گرد صرف ایک سال میں چکر پورا کرتی ہے۔ تو فضا میں اسکی رفتار بہت[2] ہی زیادہ ہونی چاہئے۔ لوگ اس بعید از فہم رفتار کو ماننے کیلئے تیار نہ تھے (زمین کی طوافی گردش کا عینی ثبوت "ثابت ستاروں" کے سالانہ اختلاف[3] منظر سے ملتا ہے۔ زمین کی اس گردش کو ستاروں کے فاصلے معلوم کرنے میں کس طرح استعمال کیا گیا؟ آئندہ قسط میں بیان ہوگا۔) کاپرنیکس کے ہمعصروں نے اس خیال کے برخلاف اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ جنکے جوابات آہستہ آہستہ ملتے گئے اُن میں سے ایک اعتراض یہ تھا۔ کہ اگر واقعی زمین کائنات کا مرکز نہیں۔ تو آسمان

ف۱ اس زمانے میں انہیں صرف پانچ سیارے عطارد۔ زہرہ۔ مریخ۔ مشتری اور زحل معلوم تھے۔ اس وقت ان کی تعداد نو ہے۔ ف۲ یہ رفتار ۶۰,۰۰۰ میل فی گھنٹہ ہے۔

ف۳ Parallax یا دور کی چیزوں کا ظاہری تبدیلی محل جبکہ انسان خود حرکت میں ہو۔

کی روزانہ گردش اور دن رات کے سلسلے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب صاف تھا۔ کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ جب بچے کھیلتے وقت اپنے ارد گرد تیزی سے گھومتے ہیں۔ انہیں گرد کی زمین۔ مکان اور درخت وغیرہ دائروں میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح آسمان کی گردش بھی ہماری نظر کا دھوکہ ہے۔ دن رات کا سوال بھی اسکے ساتھ حل ہو جاتا ہے۔ اگر زمین سورج کے گرد طواف کرتی اور اپنے گرد نہ گھومتی۔ تو اسکے اس طرف پر جو سورج کی طرف واقع ہوتا۔ دائمی دن ہوتا۔ اور دوسری جانب دائمی رات۔ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے "دن رات پر لپٹا ہوا ہے[۱]۔ اور رات دن پر"

زمین کی محوری گردش کا مندرجہ بالا سماوی ثبوت اگر ہمیں معلوم نہ بھی ہوتا۔ تب بھی ہمیں اس کا یقین ضرور ہو جاتا۔ کیونکہ اب زمین پر معملات[۲] میں ایسے تجربے کئے جا سکتے ہیں جن سے آسمان کی سمت دیکھے بغیر زمین کی محوری گردش ثابت ہوتی ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے شہروں کے عجائب گھروں میں ایسے آلات تجربہ لگے ہوئے ہیں۔ جن کو ہر شخص دیکھکر اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔

نیز زمین کی اپنی شکل[۳] پکار کر کہہ رہی ہے۔ کہ زمین گردش میں ہے۔ زمین کا قطبین پر چپٹا ہونا اس امر کا بیّن ثبوت ہے۔

(ملاحظہ ہو شکل صفحہ ۴۷ پر)

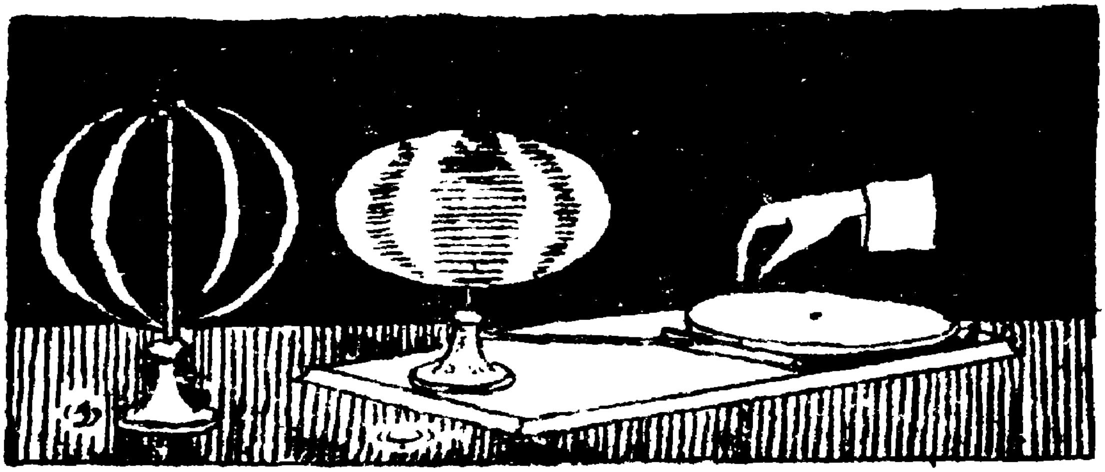
---

۱ قرآن مجید کے مندرجہ ذیل آیت (39 : 7) کا ترجمہ ہے اس آیت سے زمین کا گول ہونا اور اسکی محوری گردش ثابت ہوتی ہے۔ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ

۲ Laboratories

۳ (ا) Foucaults Pendulum (ب) Motion of gyroscopes

۴ Surveying سے معلوم کی گئی ہے۔



شکل ۴۱ (ل) میں دھاتی چھلّوں کا ایک کرّہ دکھایا گیا ہے۔ اگر اس کو تیزی سے گھمایا جائے۔ جیساکہ شکل ۴۱ (ب) میں۔ تو یہ کرّہ قطبین پر پچپٹا ہو جاتا ہے۔ اور استوائی قطر کی نسبت قطبی قطر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ جب زمین ٹھنڈی ہو کر سخت ہو جانے سے پیشتر گرم اور نرم تھی۔ اس وقت محوری گردش کی وجہ سے اس کے قطبین اسی طرح سے چپٹے ہو گئے تھے۔

زمین کی محوری گردش کی وجہ سے کرۂ ہوائی میں قطبین پر جو منطقات سکون پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے منقلب تجارتی ہوائیں قطبین کی سمت چلتی ہیں۔ شاید قارئین کرام کو معلوم ہوگا۔

زمین کی محوری گردش کی وجہ سے پشاور تقریبًا ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کے رفتار سے دائرے میں چل رہا ہے۔ طوافی گردش کی بدولت ..... میل فی گھنٹہ سورج کے گرد دوڑ رہا ہے۔

ہمارے بزرگ اس چاند کے تشکلات کے مشاہدے سے اس نتیجہ پر بھی پہنچا۔ کہ چاند زمین کا

Phases کبھی ہلال کی شکل اختیار کرتی ہے۔ کبھی بدر کی۔

"سیارۂ ثنویہ"[1] ہے۔ یعنی کہ چاند زمین کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔ ایک چکّر میں اس کو ½۲۷ دن لگتے ہیں۔

چاند زمین کے جسم سے کسطرح جدا ہوا؟ اور اس کا آیندہ کیا حشر ہوا چاہتا ہے؟ آیندہ قسط میں بیان کیا جاوے گا۔

آج سے ۳۰۰ سال قبل گلیلو نے اپنے بنائی ہوئی دوربین کے ذریعے ان تمام باتوں کی تصدیق وثوق سے کرلی تھی۔ سب سے دلچسپ منظر جو اس کی دوربین سے دیکھا گیا۔ وہ مشتری کے گرد چار چاندوں کا گھومنا تھا۔ یہ منظر اس بات کا عینی ثبوت بھی تھا۔ کہ تعمیر کائنات میں اس قسم کے طوافی نظامات کا پایا جانا کوئی غیر معمولی واقع نہیں۔

ان انکشافات کے ساتھ ساتھ علم زائچہ یا جوتش (Astrology) کا وقار بھی حسب توقع یک قلم موقوف ہوگیا۔ توہمات کی تعمیر پارینہ دوربین کی تقدیر شکن گرز کی ضرب کاری سے پاش پاش ہوگئی ہے۔ یعنی جب سے "سماوی دیوتا" اس کی زد کے نخچیر بنے ہیں۔ "تقدیر کے زندانی" مفقود ہو چکے ہیں۔ اور علم زائچہ یا جوتش کا جنازہ تب سے بہت گہرا[2] دفن کیا جاچکا ہے۔ مریخ یا منگل کی فتنہ انگیزیاں۔ عطارد یا بدھ کی عقل ریزیاں مشتری یا برھسپت کی زرریزیاں۔ زہرہ یا شکر کی التفات نوازیاں۔ زحل یا سنیچر کی نحوست افزائیاں جاتی رہی ہیں۔ زمانۂ حال انہیں خرافات کہتا ہے۔

---

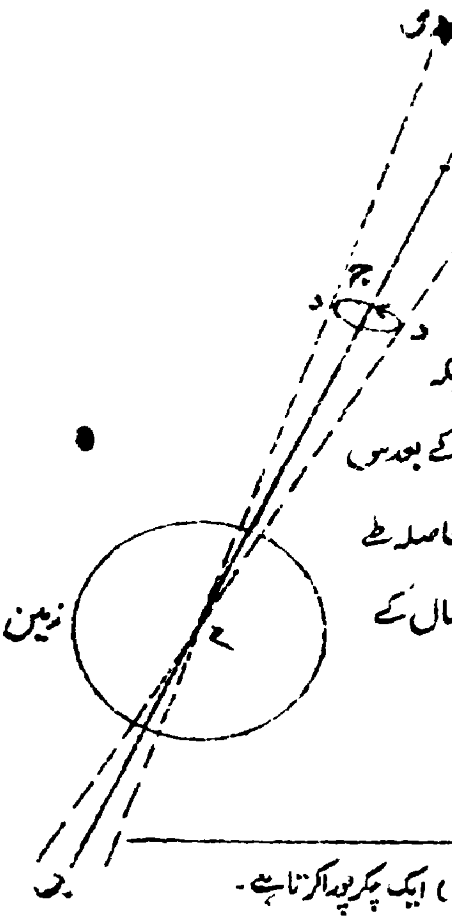
[1] سیارۂ ثنویہ یعنی Secondary Planet یا تابع (Satellite)

[2] ہندوستان پر شاید ابھی تک یہ فقرہ عائد نہیں۔

کیونکہ سیاروں کا دیوتا ہونا تو درکنار وہ تو خود سورج کی زنجیر غلامی میں جکڑے ہوئے بڑی پریشانی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور اس لئے جیسا کہ اقبال نے فرمایا ہے۔

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخئ افلاک میں ہے خوار و زبوں

قطبی ستارہ :۔ اب رہا یہ سوال کہ قطبی ستارہ آسمان کی ظاہری گردش میں حصہ کیوں نہیں لے رہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قطبی ستارہ زمین کے محور پر واقع ہے اگر زمین کے فرضی محور کو شمال کی طرف بڑھایا جاوے۔ تو فضا میں دور دراز فاصلے پر وہ قطبی ستارے پر سے گذریگا۔ دیکھو شکل ۲



(قطبین کو ملانے والا) محور زمین
و ج م یا قطبی ستارہ پر سے گذر رہا ہے ۱۲۹۰۰ سال پہلے نقطۂ د پر سے گذر رہا تھا۔ جبکہ کوئی اور ستارہ س قطبی تھا۔ ۱۲۹۰۰ سال کے بعد س قطبی ستارہ ہوگا۔ محور ج اور د کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں دو دفعہ یعنی تقریباً ہر ۵۰۰۰ سال کے بعد قطبی ستارہ بدلے گا۔

---

۲ یہ محور ۲۵۸۰۰ سال میں (دائرہ د د کے گرد) ایک چکر پورا کرتا ہے۔

چونکہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ اس لئے آسمان ظاہری طور پر اس کے محور کے گرد گھومنے ...... دکھائی دیتا ہے۔ قطبی ستارہ جب اس محور پر ہے۔ تو وہ کیسے اس کے گرد گھوم سکتا ہے؟ لازماً یہ ساکن دکھائی دیتا ہے۔ اور ہمیشہ شمال کو رہتا ہے۔ البتہ آسمان اس کے گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں پر یہ بتانا برمحل ہوگا۔ کہ محورِ زمین بھی آہستہ آہستہ اپنی سمت بدلتا رہتا ہے (جیسے گھومتے ہوئے لٹو کا محور) اور ۵۰۰۰ سال میں اس کی سمت اتنی بدل جائے گی۔ کہ قطبی ستارہ "قطبی" نہیں رہے گا۔ بلکہ ہمارے عین شمال میں محور کے رستے میں ایک اور تارہ پڑے گا۔ اور وہی "قطبی ستارہ" کہلائے گا۔ ۵۰۰۰ سال پہلے ہمارا قطبی ستارہ اور تھا۔ موجودہ قطبی ستارہ ۲۵۰۰۰ سال کے بعد پھر ہمارا قطبی ستارہ ہوگا۔ زمین کا محور کیوں اپنی سمت بدلتا رہتا ہے؟ ... کا جواب برموقع آئندہ اقساط میں دیا جاوے گا۔

کاپرنیکس اور گلیلو نے کچھ حدتک اس جستجویانہ سوال کا جواب کہ "انسان کائنات میں کہاں کھڑا ہے" دیدیا تھا۔ انسان جس زمین پر ہے۔ وہ دوسری زمینوں (عطارد۔ زہرہ۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل وغیرہ) کی طرح سورج کے گرد طواف کر رہی ہے۔ ہماری زمینیں سورج کے کُنبے یعنی نظام شمسی کا ایک رکن ہے۔ (سورج سے یہ زمینیں کیسے جدا ہوئیں؟ آئندہ قسط میں بتایا جاوے گا) کائنات میں ہمارے سورج کی بستی کہاں پر واقع ہے۔ اور یہ کائنات کی دیگر بستیوں سے کسقدر ممتاز یا غیر ممتاز ہے؟ آئندہ اقساط میں بیان ہوگا۔ (محمد جان)

ملہ مشتمل بر سورج و سیارگان۔

صوبہ سرحد اور صنعتی تعلیم

ہر زمانے اور ہر ملک کی ضروریات زندگی کا انحصار اس کے طرز معاشرت پر ہوتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کیلئے پتھر اور دھات کے زمانے کی طرف غور کریں تو معلوم ہوگا۔ کہ اس وقت کی ضروریات صرف پتھر اور دھات کے برتن اور سامان حرب سے پوری ہوتی تھیں۔ اس کے بعد زمانہ بتدریج ترقی کرتا گیا۔ اور زمانہ سلف کے لوگوں کی ضروریات زندگی بھی بتدریج بڑھتی گئیں۔ رہنے کیلئے مکان۔ پہننے کیلئے کپڑے اور کھیتی باڑی کیلئے عمدہ طرز کے اوزاروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ان لوگوں نے وقت کے مطابق اسمیں نمایاں ترقی کی۔ اور اپنی ضروریات کو احسن طریقہ پر سرانجام دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اشوک اور وکرماجیت کے زمانے میں فن تعمیر اور حکمت نے اس قدر ترقی حاصل کی۔ کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ جنوبی ہندوستان کے مندر۔ اور پرانی عمارات اس بات کی شاہد ہیں۔ ٹیکسلا کے عجائب خانے میں اس زمانے کے تحفہ جات دیکھ کر انسان فوراً اس نتیجے پر پہنچتا ہے۔ کہ زمانہ سلف کے لوگ اپنی ضروریات زندگی کے لحاظ سے بالکل مکمل تھے۔ اسی طرح زمانہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا۔ اور طرز معاشرت میں نمایاں فرق آتا گیا۔ جہاں انسان اپنے جسم کو درختوں کے چھال سے ڈھانپتا تھا۔

وہاں آج عمدہ لباس ہیں ملبوس ہے ۔ جہاں تانبے اور مٹی کے برتن استعمال کئے جاتے تھے ۔ وہاں آج عمدہ عمدہ قلعی اور چاندی شدہ ظروف کی ضرورت پڑتی ہے ۔ صوبہ سرحد بھی دوسرے ممالک اور صوبوں کی طرح ترقی کے راہ پر گامزن ہے ۔ اسے بھی جدید طرز معاشرت کی پیروی کرنا ہے ۔ لیکن جبتک یہ صوبہ اپنے لئے ضروریات زندگی خود پیدا نہیں کر سکتا ۔ اس وقت تک ترقی کی طرف قدم بڑھانا محال ہے ۔

صوبہ پنجاب نے جب ترقی کی طرف قدم بڑھایا ۔ تو اس وقت اُس کی حالت آج کے صوبہ سرحد سے بہتر نہ تھی ۔ لیکن طرز جدید ان لوگوں کو اس معیار پر لے آئی ۔ جن کی ان کو ضرورت تھی ۔ بہت سے لوگ صنعتی درسگاہوں میں دستکاری کی تعلیم حاصل کرکے اپنے صوبے کی عام ضروریات کو پورا کرتے رہے اسمیں سب سے زیادہ حصہ میو سکول آف آرٹس لاہور نے لیا ۔ اور کئی سالوں تک ترکھان ۔ لوہار ۔ آرٹسٹ ۔ سنار وغیرہ تیار کرکے باہر نکالتا رہا ۔ اِصلاحات ملنے پر صوبے کی فلاح و بہبود صرف صنعتی ترقی پر ضروری سمجھی گئی ۔ اور اسی غرض سے کئی ایک صنعتی ادارے قائم کئے گئے ۔ امرتسر میں کپڑا بننے کیلئے ایک سکول کھولا گیا ۔ شاہدرہ میں چمڑا رنگنے اور کپڑا چھاپنے کیلئے ایک ادارہ کھولا گیا ۔ انبالہ اور سیالکوٹ میں لوہے اور پیتل کی اشیاء بنانے کیلئے درسگاہیں کھولی گئیں ۔ جالندھر میں اعلےٰ پیمانے پر لکڑی کا سامان تیار کرنے کا سکول کھولا گیا ۔ کلّو میں کمبل اور گرم کپڑا بننے کے لئے ایک درسگاہ کھولی گئی ۔

(باقی آیندہ)

تعلیم اور سکاؤٹنگ

تعلیم اور سکاؤٹنگ ایسے الفاظ ہیں جنکو لکھے پڑھے اور ان پڑھ سبھی استعمال کرتے ہیں۔ اور ہر ایک اُن سے اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق معنی لیتا ہے۔ اور جس قدر اس کی اہلیت اور سمجھ ہوتی ہے۔ اس سے مستفید یا غیر مستفید ہوتا ہے۔ "غیر مستفید ہوتا ہے" کے الفاظ سُن کر آپ کو متحیّر نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ جو شخص کسی علم کی تہہ تک پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ اس سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ ہی اس کو مستقل طور پر اپنے یا اوروں کے کام میں لا سکتا ہے۔ اسلئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہر دو الفاظ کی تشریح کی جائے۔

میں پہلے لفظ تعلیم کی تشریح کرونگا کہ یہ کیا چیز ہے؟ اور کس طرح مختلف لوگ اس کو مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اور کس حد تک حق بجانب کہلائے جا سکتے ہیں۔ اوسط درجہ کا آدمی تعلیم کا مفہوم یہ لیتا ہے کہ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے۔ کہ وہ کم سے کم محنت سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روپیہ یا روزی کما سکے۔ اس کی تمام تر کوشش اس بات میں صرف ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے بچے کو ایسی تعلیم دے جس سے اسکا نصب العین صرف روزی کمانا بن جائے۔ مگر صرف روزی کمانا تعلیم کا واحد مدعا سمجھ کر اسی پر کاربند رہنے والا شخص لفظ تعلیم کو بہت محدود معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا منشا صرف یہی نہیں۔ کہ وہ خوراک کو بہم پہنچائے اور اسی کو اپنا منتہائے مقصد سمجھے۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کو قائم رکھنے کیلئے یہ بھی ضروری چیز ہے۔ لیکن اس قدر

ضروری نہیں۔کہ اس کی خاطر انسان کی زندگی کا اصلی مدعا فوت ہو جائے۔ اسکے علاوہ بعض لوگ کہتے ہیں۔کہ تعلیم کا مدعا علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا ہونا چاہیئے۔ اور اس پر اس قدر زور دیتے ہیں۔کہ اپنی تمام تر طاقت کو اسی میں صرف کر دیتے ہیں۔ وہ صرف اس آدمی کو عالم سمجھتے ہیں جس نے بہت سی کتابیں پڑھی ہوں۔ با موقعہ اور بے موقع بڑے بڑے اور ثقیل الفاظ استعمال کر سکے۔ اور ہر وقت کتابوں کے حوالے دے سکتا ہو۔ مصنفین اور مولفین کی رائے لوگوں کے کاربند ہونے کیلئے پیش کر سکتا ہو۔خواہ وہ خود اس پر کاربند نہ ہو۔ اور وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اسی کتابی اور سطحی علم کی بدولت اوروں پر فوقیت حاصل کرے۔ اسکا ذہنی رجحان اور مذاق صرف کتب بینی بن جاتا ہے۔ اور علم کو عمل میں نہیں لا سکتا۔مگر جب تک علم کو عمل میں نہ لایا جا سکے۔تب تک وہ علم بیکار رہے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے "نالج از پاور" یعنی علم طاقت ہے۔لیکن یہ طاقت صرف اس صورت میں ہے۔جب کہ علم کے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسکا استعمال بھی جاری رہے ورنہ یہ علم بغیر عمل کے ہوگا۔ اور طاقت کی حیثیت نہیں رکھیگا۔ اور انسانی زندگی کے لئے مفید نہیں ہوگا۔ اور ایسا عالم "جاہل عالم" کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اگر علم کا حاصل کرنا اور اس کا استعمال کرنا دونو پہلو بہ پہلو جاری ہوں۔ اور یہی تعلیم کا مدعا ہو۔ تو پھر بھی کسی حد تک مفید ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی اور چیزوں کی ضرورت ہے۔جنکو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اور وہ چیزیں برمحل قوت فیصلہ، ذہانت اور ذہنی استعداد یا بالفاظ دیگر حسن برکتِ علم اور اخلاقیات کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ تعلیم کا مدعا فوت ہو جائیگا۔

بعض لوگوں کا مدعائے تعلیم یہ ہے۔کہ قوائے انسانی کی موزوں اور متناسب نشو و نما کی جائے۔ اور ہر ایک قوت کی باقاعدہ تربیت کی جائے لیکن یہ نظریہ تعلیم بہت پرانا ہے۔ اور

موجودہ زمانہ میں ایک حد تک غیر مفید اور غلط قرار دیا گیا ہے۔ علماء اور ماہرین نفسیات نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ انسانی نفس کے کوئی مقرر شدہ حدود نہیں۔ اور نہ ہی وہ حدود بندی خاص خاص علوم کی خاطر ہے جن میں وہ علوم بھر دیئے جائیں۔ اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ ہو۔ اسطرح انسان کی تکمیلِ تعلیم ہو سکے اسلئے یہ مدعائے تعلیم بھی وسیع اور ہمہ گیر نہیں ہے۔

منجملہ دیگر غیر وسیع مدعاؤں کے بعض لوگوں کے خیال میں تعلیم کا مقصد حصولِ اخلاق ہے۔ اور تمام تعلیم کی بنیاد اخلاقیات پر رکھتے ہیں۔ حصولِ اخلاقیات ایک اچھی چیز ہے لیکن دقت یہ ہے۔ کہ مختلف اقوام میں اخلاق کے معیار مختلف ہیں۔ اور اگر کسی ایک قوم کے اخلاقی معیار کو نصب العین بنا کر تعلیم دی جائے۔ تو ایسا دائرہ تعلیم محدود رہیگا کیونکہ وہ نہ صرف کسی مخصوص قوم یا فرقے کا فرد ہے۔ بلکہ وہ بحیثیت انسان تمام انسانی معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے یہ مدعائے تعلیم بھی ادھورا ہے۔ اس تمام بحث سے مراد یہ ہے۔ کہ تعلیم کو ہمیشہ وسیع معنوں میں لینا چاہیئے۔ اور اس کیلئے ہمیں زمانۂ حال کے ماہرین تعلیمات کے نظریۂ تعلیم کی طرف جانا چاہیئے۔ جو کہتے ہیں۔ کہ تعلیم کا مدعا معاشری تکمیل ہونا چاہیئے۔ جنکا مقولہ ہے کہ "تعلیم وہ بہتر ہے۔ کہ معاشرے کے افراد کو مکمل انسان بنائے" اور مکمل فرد کی یہ تعریف کرتے ہیں۔ کہ وہ اس قابل ہو۔ کہ اسکی ذات ان تمام طاقتوں میں حصہ لے سکے۔ جو معاشرے کے اٹھانے اور بہبودی کیلئے استعمال ہو رہی ہوں۔ اور وہ اس معاشرے کے ممبر کی حیثیت سے ہر طرح فراخ دل ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی بڑھتی ہوئی انفرادیت، شخصیت اور سیرت کو ہر لحظہ ترقی دے۔ اگر ممبرانِ معاشرہ کو ایسی تعلیم نہ دی جائے۔ تو وہ ایک مکمل اور ممتاز سوسائٹی نہیں ہو سکتی۔

ایسی تعلیم دینے کیلئے ماہرین تعلیمات کوشش کرتے رہے ہیں۔ کہ بہترین طریق رائج ہوں اور کئی ایک طریقۂ تعلیم رائج ہوئے۔ کوئی ان میں کامیاب اور کوئی ناکامیاب ثابت ہوا۔ ان تمام کامیاب

طریقوں میں سے بہترین طریقۂ تعلیم جسکو دنیا کے ماہرین تعلیمات مانتے ہیں۔ وہ صرف سکاؤٹنگ ہے۔ بشرطیکہ وہ موجد کی صحیح ہدایات کیمطابق برتا جائے۔ اس موقعہ پر اس طریقۂ تعلیم کا مفصل ذکر نہیں کیا جا سکتا لیکن اس قدر کہونگا کہ اس طریقہ سے جو تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے نظریہ کی بنا پر ہے جو سائنس کیساتھ عین مشابہت اور مطابقت رکھتی ہے۔ اور یہ بھی واضح رہے۔ کہ سائنس کی ایک ایسی صداقت ہے۔ جسکے اندر جھوٹ اور خامی کی گنجائش ہی نہیں۔ اب آپ کو خیال پیدا ہوگا۔ کہ وہ سائنس کونسی ہے اور وہ نظریہ کیا ہے؟ وہ سائنس علم نفسیات (سائیکالوجی) ہے۔ اور وہ "نظریۂ تعلیم انسانی فطرت اور انسانی جبلّتوں کی بنا پر ہونی ضروری ہے" ماہرین علم نفسیات تعلیمات نے اپنی سائنس کے ذریعے یہ ثابت کردیا ہے۔ کہ جو تعلیم و تربیت جبلّتوں کی بناء پر نہ ہوگی۔ وہ طالب علم کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ اس میں دلچسپی نہیں لیگا۔ اس کے تجربات اسکے نفس کے اندر مستقل جگہ لیکر مفید تجربات کی حیثیت اختیار نہیں کرسکیں گے۔ لہٰذا ایسی تعلیم تضیع اوقات ہوگی۔ اگر تعلیم سے ساتھ تعلق رکھنے والے اصحاب یہ چاہتے ہیں۔ کہ وہ ایک ایسا طریقۂ تعلیم اختیار کریں۔ جو جبلّتوں کی بناء پر ہو۔ اور ہر قسم کے تجربات بہم پہنچانے کے لئے ایک مرکزی طریقۂ تعلیم اختیار کریں۔ تو وہ صرف سکاؤٹنگ ہی ہے۔ میں اس موقعہ پر اس طریقۂ تعلیم کے بہترین ہونے کے ثبوت میں ایک ماہر فن تعلیم و نفسیات تعلیم ڈاکٹر جیمس راس وائس پرنسپل وسٹ منسٹر ٹریننگ کالج لنڈن کی رائے پیش کرتا ہوں۔ جسکا ترجمہ یہ ہے۔ کہ "سکاوٹنگ میں انسانی فطری قوٰی کو عمل میں لانے اور جبلّتوں کو مکمل طور پر اظہار کا موقعہ ملتا ہے۔ اور انکا تنقیہ ہوتا ہے۔ نیز اس میں آئندہ عملی زندگی کے زمانے کے لئے گرانقدر تیاری ہے۔ ذہنی تعلیم بھی نظر انداز نہیں کی گئی۔ اسکی کامیابی کے ایک پہلو کو "بوائے سکاوٹس جیومیٹری" پورے طور سے ظاہر کرتی ہے لیکن اس کی بہترین کامیابیاں تعمیر سیرت میں ہوئیں۔"

غلام سرور

ایمپائر الیکٹرک پریس (گورنمنٹ پرنٹرز) پشاور صدر

مفتی عزیز الرحمٰن فاتح مالک ومہتمم نے ایمپائر الیکٹرک پریس پشاور صدر میں چھاپ کر دفتر مشعل سے شائع کیا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری ظلمت میں، مَیں روشن چراغاں کرکے چھوڑونگا

اقبالؔ

صوبہ سرحد کا واحد تعلیمی مجلہ

مشعل سرحد پشاور

ایڈیٹر
مفتی عزیز الرحمٰن بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس

مقام اشاعت:۔ گورنمنٹ ٹریننگ سکول (مردانہ) پشاور

چندہ سالانہ:۔ ۳ ر   فی کاپی ۶ ر

عملہ ادارت

مجلہ مشعل سرحد پشاور

جلد ۲	اگست سنہ [illegible]	نمبر ۲

ٹیکسٹ بک کمیٹی اور اُس کے فرائض

موجودہ مدارس میں جو کتب استعمال ہوتی ہیں۔ خواہ وہ درسی کتب ہوں یا لائبریری یا انعامی کتب وہ ایک کمیٹی کی منظور کردہ ہوتی ہیں جسے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کے ممبر ہر جماعت ہر خیال اور ہر مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کمیٹی میں مدارس کے منیجر و ہیڈ ماسٹر و انسپکٹر بھی شامل ہوتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں و میونسپل بورڈوں کے نمایندے بھی حصہ لیتے ہیں اور ہر مذہب کے پیرو بھی بحیثیت ممبر اظہار خیال کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ ان ممبروں کی تعداد مقرر ہوتی ہے اور ان کو مقامی حکومت بمشورہ افسران بالا محکمہ تعلیم نامزد کرتی ہے اس کمیٹی کی بہت سی سب کمیٹیاں ہوتی ہیں۔ جن کے ممبر مختلف مضامین کی کتب پر غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد تحریری رائے زنی کرتے ہیں اور ہر ایک کتاب پر کم از کم تین ممبروں کا ریویو ہونا لازمی ہوتا ہے جب مختلف ممبروں کی آزادانہ رائے سیکرٹری صاحب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے پاس پہنچ جاتی ہے تو متعلقہ سب کمیٹی کا اجلاس قائم کیا جاتا ہے۔ جس میں اُن آراء کی بنا پر ہی نہیں جو قبل ازیں موصول ہو چکی ہیں بلکہ موجودہ ممبروں کی چھان بین کے بعد ایک متفقہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو سفارش کے طور پر کمیٹی کے اجلاس عام میں جہاں سب ممبر موجود ہوتے ہیں۔ پیش ہو کر کافی بحث و مباحثہ کے بعد اور ضروری ترمیم کے ساتھ آخری اور قطعی فیصلہ کی صورت میں منظور ہو کر بغرض اشاعت سیکرٹری صاحب کے حوالہ کیا جاتا ہے اور کتب کے زیر استعمال آنے سے کئی ماہ پیشتر کتب زیر غور کے طابعین و ناشرین ومصنفین و مؤلفین کے پاس اطلاعاً بھیجا جاتا ہے۔ ان حالات کو پبلک کی واقفیت کے لیے اس غرض سے شائع کرنا ضروری سمجھا گیا ہے کہ اخبارات میں وقتاً فوقتاً جو قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ اُن سے راقم ان کی حد درجہ عدم واقفیت کا ثبوت ملتا ہے اور یہ عدم واقفیت بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرکے ایسی طویل بحثوں کے ذریعے تضییع اوقات کا موجب ہوتی ہیں۔

عزیز الرحمٰن مفتی

وار دھا سکیم

(از خواجہ محمد سلیمان بی۔ ایس۔ سی (علیگ) بی۔ ٹی)

یوں تو مدت سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ ہندوستان کا موجودہ نظام تعلیم ہماری ملکی ضروریات کے بالکل منافی ہے مگر جوں جوں ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا ہوتی گئی۔ اس خیال کو روز بروز تقویت ملتی گئی تمام لیڈروں نے پریس اور پلیٹ فارم پر موجودہ نظام تعلیم کے برخلاف جہاد کیا مگر سب لاحاصل موجودہ نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا مقصود یہ ہے اُس کے فارغ التحصیل نوجوان کام کاج سے گریز کرتے، محنت سے بھاگتے۔ ہندوستانی اشیا اور کاریگروں سے نفرت کرتے ہیں۔ اور ملکی ضروریات سے بے پرواہ ہو . . . . کہ ہندوستان کی تہذیب معاشرت اور زبان کو ملک سے آہستہ آہستہ مٹا رہے ہیں۔ اور دوم یہ کہ اُس نے پڑھے ہوئے بیروزگاروں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کر دیا اور کر رہا ہے جس سے ملک میں ایک بہت بڑی تکلیف پیدا ہو رہی ہے اگر اس نظام کو یونہی چلنے دیا جائے۔ تو کچھ عرصے کے بعد ملک کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑیگا جس کا نتیجہ نہایت خطرناک اور امن سوز ہوگا۔

اپریل ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کو صوبائی خود اختیاری مل گئی۔ گیارہ میں سے سات صوبوں میں کانگرس نے عنان حکومت سنبھال لی۔ تو قدرتی طور پر مہاتما گاندھی نے جو کہ کانگرس کے کرتا دھرتا ہیں۔ نظام تعلیم کو بدلنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ماہران تعلیمات کے سامنے واردھا میں اپنے تعمیری خیالات پیش کیے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی بہتری صرف دیہات والوں کی ترقی سے ہی ہوسکتی اس لیے ضروری ہے کہ اُن سب کو تعلیم سے مستفید کیا جائے۔ لیکن موجودہ نظام تعلیم اُن کے لیے بے فائدہ ہے۔ کیونکہ یہ اُن کے بچوں کو اُن کے کام سے نکال کر اُن کے لیے بالکل عضوِ معطل بنا دیتا ہے۔ اس لیئے اُن کو ایسی تعلیم دینی چاہیئے۔ جو کہ اُن کے بچوں کو اُن کی ضروریات کے مطابق اُسی ماحول میں ایسے طرز سے دی جائے۔ جو کہ ملک کے لیے بحیثیت مجموعی مفید ہو۔ اس لیے اُن کو

کوئی صنعت بھی سکھانی ضروری ہوگی۔ ہندوستان میں کپڑے کا بُننا ایک ایسا کام ہے جو بلا دقت ہر جگہ جاری ہو سکتا ہے اور اُس کپڑے کی آسانی سے کھپت بھی ہو سکتی ہے اِس لئے اُن کو کپڑا بُننا یا کوئی اور مناسب صنعت بھی سکھائی جائے مگر یہاں ان سکولوں میں جملہ مضامین کو بنیادی صنعت کے ارد گرد لپیٹ کر قدرتی تعلق پیدا کر کے سکھانا چاہتا ہوں ۔ تا کہ کام کام میں اُن کی اخلاقی ذہنی اور جسمانی ترقی ہو اور وہ اپنا خرچ بھی نکال سکیں ۔ پھر موجودہ زمانے میں بہت سا وقت انگریزی زبان کے سیکھنے میں صرف کیا جاتا ہے یہی وقت بچا کر بنیادی صنعت کو دیا جا سکتا ہے ۔

مہاتما گاندھی کے تمام خیالات کا خلاصہ یہ ہے

۱ ۔ ابتدائی تعلیم سات سال یا زیادہ کے عرصہ میں موجودہ میٹرک معیار کے تمام مضامین بغیر انگریزی کے مع ایک بنیادی صنعت کے سکھائے جائیں ۔ اور تمام مضامین بنیادی صنعت کے ساتھ بُنے ہوتے ہوں

۲ ۔ یہ تعلیم مجموعی طور پر اپنے خرچ کی خود کفیل ہو اور یہی اس کی کامیابی کا سب سے بڑا معیار ہوگا ۔

ان خیالات کو عملی صورت میں لانے کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی ۔ جس نے نہایت جانفشانی اور محنت سے اِس سکیم کو تیار کیا جو کہ بمقام اجلاس کی نسبت سے واردھا سکیم کے نام سے موسوم ہے

اس سکیم کے مطابق پرائمری سکول کا نصاب سات سال کا ہوگا اور یہ سکول موجودہ پرائمری اور سکنڈری مدارس کی جگہ لیں گے ۔ اس میں ۷ سال کی عمر کا بچہ داخل کیا جائیگا اور اپنی تعلیم کی تکمیل تیرہ برس کی عمر میں کرے گا ۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج یا اعلیٰ صنعتی تربیت کے لئے کسی فیکٹری میں جا سکیگا ۔ اس سکول کے نصاب کا مجوزہ خاکہ ذیل میں دیا جاتا ہے ۔

I <u>بنیادی صنعت</u> :۔ اس میں اتنی مہارت پیدا ہو جائے ۔ کہ وہ سکول چھوڑنے کے بعد اس کو بطور پیشہ اختیار کر سکے ۔ مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک صنعت سکول میں جاری ہوگی :۔

(۱) سوت کاتنا اور کپڑا بُننا (۲) نجاری ، (۳) زراعت (۴) سبزی اور پھلوں کی کاشت ۔ (۵) چمڑے کا کام (۶) کوئی اور صنعت جو علاقہ کے جغرافیائی حالات کے مطابق ہو ۔

جس سکول میں زراعت یا سکول میں کپڑا بننے کے علاوہ کوئی اور بنیادی صنعت ہوگی وہاں بھی کاتنے اور زراعت کے ابتدائی عملی کام سے واقفیت ضروری ہوگی۔

II **مادری زبان** ۔ میں اتنی مہارت ہو (ل) کہ قدرتی لہجہ میں ذوق کے ساتھ اپنے ماحول کی اشیاء لوگوں اور واقعات کے متعلق آزادی سے گفتگو کرسکے۔

(ب) روزمرہ عام واقعات پر صفائی سے بادلیل تقریر کرسکے۔

(ج) تیز خاموش مطالعہ کرسکے، اور اس میں اتنی قدرت پیدا ہو جائے کہ آسانی سے اخبار ورسائل کا مطالعہ کرسکے۔

(د) بلند آواز سے نظم اور نثر کو صاف مؤثر طریقہ پر پڑھ کر لطف اٹھا سکے۔

(ہ) لائبریری کو ضروری معلومات کے حصول اور تفریح کے لئے استعمال کرسکے۔

(و) خوش خط، صحیح اور تیز لکھ سکے۔

(ز) روزمرہ کے واقعات، انجمنوں اور جلسوں کی روئداد آسان الفاظ میں لکھ سکے۔

(ح) ذاتی اور آسان تجارتی خط وکتابت کرسکے۔

(ط) اپنی زبان کے بلند پایہ مصنفین کی تحریروں سے واقفیت رکھتا ہو۔

III **حساب** :۔ آسان حساب اور جیومیٹری کے سوالات جن کا تعلق بنیادی صنعت۔ گھر کے کاروبار اور دیہاتی زندگی سے ہو آسانی سے حل کرسکے۔ فرضی ہندسوں اور رقموں کی بجائے اصلی واقعات اور ضرورتوں کے مطابق سوال نکلوائے جائیں۔ طلباء کو تجارتی کاروبار کا علم ہونا ضروری ہوگا۔

IV **معاشری مطالعہ** :۔ تاریخ جغرافیہ شہریت اور روزانہ واقعات، بمع دنیا کے مذاہب کا ایسا علم جس سے مذاہب کی یگانگت ظاہر ہو۔ یہ مطالعہ بچے کے اپنے ماحول اس کے معمات سے شروع ہو کر خود بخود اس کو سارے علم پر حاوی ہو جائے۔ اور اسی کے ذریعے بچہ میں بنی نوع انسان کی زندگی اور کاروبار کے متعلق دلچسپی پیدا کرنے کی ابتدا کی جاوے۔

(۱) **تواریخ** ۔ تاریخ ہند کا ایک آسان خاکہ جس میں ہندوستانیوں کی معاشری اور تہذیبی ترقی کے زمانوں

پر زیادہ زور دیا جائے۔ اور اس خاکہ میں محبت سچائی انصاف قومی اتحاد انسانی برادری اور مساوات پر زیادہ زور دیا جائے۔ بڑے بڑے مصلحوں کے حالات اور کارناموں کا مفصل ذکر ہو۔ ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی بیداری کی تاریخ بھی بتائی جائے اور ہر ایک سکول میں قومی ہفتہ منایا جائے۔

۲۔ شہریت :۔ رفاہ عام کے تمام محکموں کے متعلق واقفیت دی جائے۔ پنچایت، انجمن امداد باہمی سرکاری ملازمین کے فرائض، بورڈوں کی تشکیل، ووٹ کی اہمیت۔ کے متعلق طلبا کو پوری واقفیت دی جاوے۔ سکول کے اندر ایسے ادارے ہوں جن سے ان تمام کی واقفیت پختہ ہو جائے۔

۳۔ جغرافیہ :۔ تمام دنیا کا مکمل اور ہندوستان کا مفصل جغرافیہ اس طرح پر پڑھایا جائے کہ ہندوستان کا باقی ممالک سے تعلق بھی پتہ لگ جائے۔ اس کی تفصیل یہ ہو۔

ا :۔ انسانی حیوانی اور نباتاتی زندگی کا عام مطالعہ، اور اپنے علاقہ کا خاص مطالعہ۔ مشاہدہ پر زیادہ زور دیا جائے۔

ب :۔ موسمی حالات کے متعلق عملی کام، سورج کا مطالعہ۔ اس کی دوپہر اور سال کے مختلف اوقات میں اونچائی۔ مقیاس الہوا۔ مقیاس الحرارت۔ اور حرارت پر دباؤ کا اندراج۔ بارش۔ ہواؤں کا رُخ وغیرہ کا اندراج۔

ج :۔ نقشہ بنانا، اور سمجھ لینا۔ گردونواح کے متعلق سطح کی واقفیت۔ اور اس کا خاکہ تیار کرنا اٹلس وغیرہ کا استعمال جاننا

د :۔ تجارتی اور معاشرتی ذرائع آمد و رفت کا مطالعہ

۴ :۔ پیشوں کا مطالعہ :۔ بالخصوص اپنے علاقہ کی زراعت اور صنعت کا مطالعہ، زراعت کی قسموں، جغرافیائی ماحول کا صنعتوں پر اثر اور ہندوستان کی مختلف صنعتوں کا مفصل مطالعہ

IV سائنس :۔ مطالعہ قدرت۔ ماحول کے درختوں، فصلوں، جانوروں، پرندوں

سے واقفیت۔

علم نباتات:۔ پودے اور اُن کے مختلف اجزاء کا نام۔ بونے، بڑھنے کے مختلف طریقے اسکول باغ میں عملی کام۔

علم منافع الاعضا۔ انسانی جسم اور اُس کے اعضا کے کام

حفظانِ صحت:۔ صاف ہوا۔ پانی۔ خوراک اور ابتدائی فوری مدد کے متعلق واقفیت۔

تربیت جسمانی:۔ ڈرل اور دیسی کھیلیں

علم کیمیا:۔ ہوا، پانی، تیزاب۔ کھار اور نمکوں کی کیمیاوی ترکیب فوائد وغیرہ ستاروں کے ذریعے، رُخ اور وقت معلوم کر لینا۔ اور اُس کے علاوہ بڑے بڑے سائنسدانوں کی زندگی کے اہم حالات۔

VI ڈرائینگ:۔

ا۔ دیکھی ہوئی اشیاء کی تصویر بنا سکنا۔

ب۔ پودوں، جانوروں اور سائنس کے متعلقہ کام کے اشکال تیار کرنا

ج۔ نقشہ تجویز کرنا

د۔ سکیل ڈرائینگ۔ گراف وغیرہ۔

پہلے چار سال میں ڈرائینگ کے اسباق مطالعہ قدرت اور سائنس کے کام سے زیادہ متعلق ہونے ضروری ہیں۔ اور آخری سالوں میں نقشہ سکیل اور نقاشی پر زیادہ زور دیا جائے۔

VII گانا:۔ بچوں کو چند اعلیٰ گانے یاد کرا کر اس اعلیٰ فن کے ساتھ شوق پیدا کرنا۔ اور بچوں کی حرکات کو بھی اس طرح یکسانیت میں لانے کی کوشش کرنا۔

VIII ہندوستانی:۔ یہ ایک لازمی مضمون ہوگا۔ اور طلبا کو اس مشترکہ قومی زبان سے واقفیت نہایت ضروری ہوگی۔ تاکہ ہندوستان کے سب حصص ایک دوسرے سے ملحق ہو جائیں اور یہ زبان دونوں رسم الخطوں یعنی اُردو اور ہندی میں سیکھی جائے گی۔ مدرسین اور طلباء

کے لیے دونوں رسم الخطوں کا جاننا ضروری ہوگا اور ہر ایک سکول میں دونوں رسم الخطوں کا انتظام ضرور ہوگا۔

یہ ہے وردھا سکیم۔ اس پر ماہرین تعلیم کے اعتراضات اور اُن کے جوابات کے لیے مشعل کے آیندہ پرچے کا انتظار کریں۔

ہمتِ مرداں مددِ خدا

:(✿):

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ — پست ہمت یہ نہ ہو اور پست قامت ہو تو ہو (ذوق)

پھر رہا ہے سیلِ حوادث سے کہیں مردوں کا منہ — شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں ״

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں — وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے (عظیم)

سرِ شمع ساں کٹائیے، پر دم نہ ماریئے — منزل ہزار سخت ہو، ہمت نہ ہاریئے (آتش)

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے ״

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں — مبارک بزدلوں کو، گردشِ قسمت سے ڈر جانا (چکبست)

کوہ بھی ہو، تو ٹلے اپنی جگہ سے مثلِ کاہ — ہمتِ مردانہ کے آگے کوئی مشکل کہاں (حامد)

حوصلہ چاہیئے انسان کو، جو پائے عروج — پست ہمت کو بلندی بھی جو ہے پستی ہے (داغ)

مکر و فریب و ظلم، یہ سب ہمیں ہیں مگر — شیطان میں، دلیری و مردانگی نہیں (اکبر)

ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد — اگر خارے بود گلدستہ گردد (سعدی)

(مرتبہ:۔ ہدایت اللہ متعلم جے، وی کلاس پشاور)

کامیاب ابتدائی تعلیم

(از قلم سید سخاوت شاہ نذیر بخاری متعلم جے۔ وی)

موجودہ کساد بازاری اور آئے دن کی مایحتاج حیات کی فراوانی نے جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی کے مختلف دستورالعمل اور پروگرام بدل ڈالے اور ہر حالت میں مفید سے مفید تر اور بہتر سے بہترین اقدامات اور لائحہ عمل اختیار کیئے جا رہے ہیں۔ وہاں تعلیم و تعلم کا نظریہ اور نقطۂ نگاہ بھی بدلا جا رہا ہے۔ اس سے پیشتر تعلیم کا نظریہ محض یہی تھا۔ کہ کتب کے ذریعہ درس و تدریس جاری رکھی جاتے اور ضروریات زندگی کے مناسب درجہ بدرجہ نوشت و خواند سکھا دینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کا مقصد صرف ملازمت مثل کلرکی وغیرہ تھا۔ لیکن آج آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس نظریہ تعلیم پر مبنی نصاب کے خلاف ملک کے گوشہ گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے کہ "موجودہ تعلیم بیکاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ کرنے کا موجب ہے۔ ضروریات زندگی کے لیئے قطعاً مکتفی نہیں" چنانچہ حال ودیا مندر سکیم برائے تعلیم کا جدید نصاب واردھا مرتب ہوا ہے اور اس سکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے مدرسین کی ٹریننگ کا اجرا کر دیا گیا ہے۔ اس سکیم کی طرف ہر فرد بشر کی آنکھ لگی ہوئی ہے۔ کہ دیکھئے سکیم مذکور ملک کے لیئے کس قدر مفید ہو سکیگی۔ تعلیم یافتہ ذوات تو بالخصوص اس سکیم کو حرف بحرف سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی ضمن میں ہمارے صوبہ سے بھی چار اصحاب ودیا مندر سکیم میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے گیارہ ماہ رواں کو واردھا روانہ ہو گئے ہیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔

(۱) ڈاکٹر محمد جان بی، ایچ، ڈی ممبر سٹاف سکول ہذا (۲) ماسٹر غلام سرور خان ممبر سٹاف سکول ہذا (۳) خواجہ محمد اشرف خان ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ہری پور۔ ہزارہ (۴) لالہ انند پرکاش ڈی۔ آئی، ہزارہ۔

اُن کی مراسعت پر دیکھا جائیگا، کہ صوبہ کی تعلیمی پوزیشن میں کیا کیا تغیرات ظہور پذیر ہوں گے۔ اور وہ اصحاب ہم نا چیز مدرسین کے لئے اپنے ساتھ کیا تحفہ لا کر رہین منت کریں گے۔ بہر کیف اب تو ماہرین تعلیمات اور مصلحین ملک نے نہایت تحقیق و تفتیش کے بعد نظریہ تعلیم یہ قرار دیا ہے کہ کام کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ کیونکہ عملی زندگی میں کام ہی مفید ہو سکتا ہے" یعنی جب نونہالان ملک و ملت اپنی عملی زندگی میں داخل ہو کر سوسائٹی کی تشکیل کا باعث ہوں گے۔ تو ہر وقت ان کے پاس کتب مدرسہ نہ دھری ہوں گی۔ اور نہ حساب کی کاپیاں، بلکہ عملی قوت ہی ضروری ہے کہ :-

نصاب تعلیم ایسا مکمل، جامع اور مستند و مفید مرتب کیا جائے۔ اور ایسا طریقہ تعلیم اختیار کیا جائے جو معاشرے کے لئے مکمل اور لائق افراد پیدا کر سکے۔ جو اپنی اور اپنے قوم کی خدمات بخوبی انصرام کر سکیں، نہ کہ ایسے جو سوسائٹی کے لئے بارِ گراں اور موجب ننگ و ناموس ہوں، اگر تعلیم ایک طرف شہری تمدن و تہذیب کی علمبردار ہو۔ تو دوسری طرف دیہاتی سوسائٹی کی رہنما، مشعل راہ، اور مصلح کار ہو۔ غرضیکہ سیاسی، تمدنی، معاشی اور اقتصادی زندگی کے ہر پہلو پر انسان کو چلنے کے قابل بنا کر زندگی عزت و احترام کیساتھ بسر کرنیکے لائق بنائے۔ عصر حاضر میں جبکہ عوام یک قلم خواب غفلت سے بیدار ہو چکے ہیں اور اپنے حال و استقبال کو بہتر سے بہترین بنانے میں مساعی اور کوشاں ہیں وہاں ابتدائی مدارس کے اساتذہ کو بھی اپنی کروٹ بدلنی پڑیگی۔ اور رفتار زمانہ کیساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرنا ہوگی تاکہ پیشہ اختیار کردہ مکتب اپنے وجود کو عوام الناس کیلئے مفید بنا سکیں، اور سوسائٹی کے ہر فرد کے دلمیں اُنکی خدمات حسنہ کا احساس اور اعتراف ہو اور نکتہ چینی کا موقعہ نہ ملے، کیونکہ اب تو ہر کس و ناکس کی یہی آرزو ہے کہ ملک و ملت کی ترقی اور اصلاح کا ذمہ دار واحد صرف مدارس ہے۔ سو اس صورت میں مثل سابق کرسی پر بیٹھے بیٹھے حکم چلانا، پانچ گھنٹے تک معصوم اطفال کو زندانِ مدرسہ میں قید رکھنا، بول چال سے خاموش رکھنا یا آلآخر رخصت کر دینا کافی نہ ہوگا اب تو کام کا وقت ہے اور محض کام ہی آپ کا واحد ترجمان، حقیقی معاون اور سچا مدد ہو سکیگا آپ پر جلدی

ہی روشن ہو جائیگا، کہ بیکار، نکمے اور نااہل مدرسین پر کیا حشر آئیگا۔ اور زمانہ کی نامساعدت ان کی کس قدر تذلیل اور تحقیر کا موجب ہو کر انہیں قعر مذلت میں پھینک دیگی۔

جب تک موجودہ تعلیم رائج ہے ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ موجودہ تعلیم بالخصوص ابتدائی تعلیم کو ہم کس طرح خوشگوار، ہر دلعزیز اور مفید بنا کر ملک ملت کی صحیح خدمات انجام دے سکتے ہیں کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم ہی آئندہ ثانوی تعلیم کی عظیم الشان عمارت کا سنگ اساس و بنیاد ہے۔

سہ　خشت اول چوں نہد معمار کج　　　　تا ثریا می رود دیوار کج

اس واسطے اس سنگ اساس کو محکم اور پائدار طور پر لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت ہو سکے، اور عملی زندگی کے لئے تیار ہو سکیں۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ نصاب کا مقرر کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن اس کام میں جہاں تک ہمارا ہاتھ ہے پوری کوشش، پیہم جدوجہد اور مستقل مزاجی سے نونہالان قوم کی مکمل تربیت کر کے اپنے فرائض اور اہم ذمہ واریوں سے عہدہ برا ہونا چاہیئے۔

ذیل میں کامیاب ابتدائی تعلیم کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے امید کی جاتی ہے کہ علمبرداران تعلیم اپنی خداداد قابلیت اور علم کی بدولت اس سے بہتر بنانے کی مساعی جمیلہ عمل میں لادیں گے "پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا"

پہلی جماعت:-

(۱) اولیں جب بچہ مدرسہ میں آتے۔ تو اس کے فطرتی خواص کا بغور و خوض مطالعہ کر کے آئندہ تعلیم کی بنیاد رکھی جاتے۔

(۲) چونکہ ہمارے ملک میں ذریعہ تعلیم صرف اردو زبان ہی ہو سکتی ہے اس لئے ابتدائی استاد کا فرض ہے کہ وہ احاطہ سکول میں اردو بول چال کا مکمل اہتمام کرے۔ اپنے بچے کے ماحول میں صرف اردو زبان

کی صلاحیتوں رہی ہو۔

۳۔ چونکہ بچے خود مختاری اور آزادی سے دن بھر اتنا کام کر جاتے ہیں کہ ایک بڑا آدمی نہیں کر سکتا اور بسا اوقات ایسے کام بھی کر جاتے ہیں کہ بڑا آدمی بھی انہیں دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے اس واسطے مدرس کو بچوں کی توجہ آزادانہ مفید کاموں کی طرف تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد منعطف کرنی چاہیئے۔ اور خود ان ہی سے ہر کام کرایا جائے۔ تاکہ ان میں خود اعتمادی، مستقل مزاجی اور کام کرنے کی عادت پیدا ہو کر پے در پے راسخ ہوتی جائیں۔

۴:۔ اردو پڑھائی حروف تہجی کے بے معنی اور بے ڈھنگے سلسلہ سے نہ شروع کی جائے، بلکہ فطرتی طور پر طریق الصوت کے طریقہ پر الفاظ سے شروع کی جائے۔

۵:۔ سکول میں مدرس اپنی نگرانی میں بچوں کی صفائی بدن وغیرہ کا اہتمام کرے اور سکول کو گھر کی صفائی کا مکمل نمونہ بنائے۔ تاکہ بچوں میں پاک وصاف رہنے کی عادات پیدا ہو جائیں۔ اور ان کا اثر ان کے والدین پر بھی پڑے۔

۶:۔ مدرس اپنی نگرانی میں بچوں سے مختلف قسم کے کھلونے بنوائے۔ اور ایک دن نمائش کا مقرر کر کے بچوں کو عمدہ کھلونا پیش کرنے کے صلہ میں انعام دے اور وہ کھلونے ایسے ہوں، جو مقامی میلوں میں فروخت کے قابل ہوں۔ مدرس بچوں سے وہ کھلونے میلوں میں فروخت کرائے، اور ان کی آمدنی کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے رشک پیدا کرے۔

۷:۔ اس جماعت میں کیا بلکہ پرائمری کی تمام جماعتوں میں کھیل کھیل میں تعلیم دی جائے۔ یعنی اس علاقے کی جہاں وہ مدرسہ واقعہ ہے۔ مروجہ کھیلوں کو تعلیمی رنگ دیکر بچوں کے پیش کیا جائے اور کھیلوں کی مکمل فہرستیں مرتب کی جاویں۔ اس طرح بچے سکول کو ہمیں کھیل کے خیال سے آئیں گے۔ تعداد میں بین اضافہ ہوگا اور موجودہ سکول جسے بچہ ہوا اور قید خانہ سمجھتا ہے۔ بازیچہ اور تفریح گاہ خیال کریگا۔ نیز آپ جانتے

ہیں کہ اس وقت ہر مہذب ملک نے ورزش اور کھیلوں کو ملک کے لیئے لازمی قرار دیدیا ہے کیونکہ اس سے ملک شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکتا ہے۔ تنظیم، ضبط، مقابلہ، مشکلات پر قابو پانا، دوسرے سے بڑھ جانا وغیرہ مفید عادات پیدا ہوتی ہیں۔

۸:۔ مدرسہ میں خوبصورت، رنگدار تصاویر کثرت سے مہیا کی جاویں۔ کیونکہ بچے رنگ دار تصویروں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ اس واسطے ان کی تفریح طبع کا موجب ہوں گی۔ اور بچہ سکول کو عجائب خانہ کہیگا نہ کہ قید خانہ

۹:۔ آس پاس کی قدرتی اشیا اور مناظر کا بچوں سے غور طلب مستقل اور محتاج مشاہدہ کرایا جائے اور ان میں باریک بینی، علت معلول کے سمجھنے، سبب دریافت کرنے کی عادات پیدا کی جائیں۔

۱۰:۔ چونکہ بچے چست رہنا چاہتے ہیں۔ اس واسطے مدرس کو سکول کے کمپونڈ میں خاص طور پر پھول پھلواری اور کھیتی کیاری کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور ان سے وقتاً فوقتاً کھیل کے طور پر کام کرایا جائے، تا کہ ان کو اپنے آبائی پیشہ زراعت سے بھی اُنس ہو۔ بڑے ہو کر اس میں کماحقہٗ ترقی کریں اور ملازمت وغیرہ پیشوں کے متلاشی نہ ہوں۔

اکثر مدرسین اور خود بچوں کے والدین بھی یہ عذر لنگ پیش کرتے ہیں کہ "یہ ابھی بچہ ہے اس سے اتنا بڑا کام کس طرح کرایا جائے۔"

لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ لکھنا کس قدر مشکل ڈرائینگ کا نام ہے جو ننھے بچوں سے کرایا جاتا ہے دریں صورت کوئی وجہ نہیں کہ بچے مندرجہ بالا کام کو نہ کر سکیں۔ بچوں سے ہر قسم کا کام کرایا جائے اور خاص کر زراعت کے کام میں ان کے شوق کو تیز کیا جائے۔ کیونکہ بچپن کی باتیں اور عادتیں بچوں کے لوح پر کالنقش فی الحجر ہو جاتی ہیں۔ جو کبھی بھی محو اور زائل نہیں ہوتیں۔

ناظرین کرام! پہلی جماعت کی تعلیم کا ناچیز ہدیہ پیش خدمت کر کے ملتمس ہوں کہ باقی جماعتوں کے متعلق آئندہ مجلہ "مشعل" کی کسی اشاعت میں عرض کیا جاویگا

راہِ نجات

(نتیجۂ فکر سید سرور شاہ صاحب فدا متعلم جے،وی)

جو چاہے دارِ فنا میں نجات کی تحصیل
بنائے قادرِ مطلق کی جستجو کرے

تلاش کوثر و تسنیم میں کرے جو ڈھیل
کبھی نہ لب ترتر ہونگے یاد رکھ مینوش

کلیدِ گنجِ مسرت ہے زیر پائے پیل
ترے ضمیر کی راحت نہاں ہے کلفت میں

قیام شب کو بنا اپنے راستے کا وکیل
اگر تو چاہے کہ منزل پہ ہو رسید تری

یہ عارضی ہے کر و زادِ راہ کی تکمیل
سرائے کہنۂ گیتی میں تو قیام نہ کر

کرو گے سعی تو دیویہ گا راہ رو دِ نیل
اگرچہ دارِ فنا کی ہیں منزلیں دشوار

اسی سے پہلے کہ لائے پیام عزرائیل
بناؤ ایک محل اس جہان فانی میں

تیرا بھی عقدہ کشا ہوگا اے فدا اس نے
اگر تو کرلے توکل بذات ربِّ جلیل ؎

بچے کا رجحانِ طبع

(از قلم سید شہنشاہ سہا متعلم جے. وی کلاس)

بچپن کا زمانہ تمام دوسرے حیوانات کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے یہاں بچپن سے مُراد وہ تمام زمانہ ہے جب تک بچے میں اس قدر جسمانی اور دماغی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی زندگی کا رہنما بن سکے اور بحیثیت ایک آزاد انسان کے معاشرے کے مشاغل میں شریک ہو کر اپنے فرائض پورے کر سکے۔ انسانی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیئے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان کا بچپن اور تمام حیوانات کی نسبت کیوں زیادہ طوالت رکھتا ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کا یہ تمام زمانہ ایک طرح سے اکارت جاتا ہے کیونکہ اس لمبی مدت میں بچہ اپنا وقت ان اہم انسانی مشاغل میں صرف نہیں کر سکتا جو اس کے شایانِ شان ہیں۔ لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے بچپن کا طویل ہونا عین مصلحت ہے کیونکہ دوسرے جانوروں کا ماحول معین اور محدود ہے انسان کی حالت ان سے مختلف ہے اس کا ماحول نہ معین ہے اور نہ محدود، جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ہے اس نے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا ہے مادی اور ذہنی نظام قائم کئے ہیں۔ اس میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ گذشتہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر نئے کاموں اور نئے مواقع سے زیادہ عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے، اپنی سیرت کو ضرورت کے مطابق ڈھالے اور اپنے طرزِ عمل اور طرزِ زندگی میں ترمیم اور اصلاح کرے اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان کی ترقی جاری رہی ہے اس نے علوم و فنون میں اضافہ کیا ہے اور تمدن کی مجسم یادگاریں چھوڑی ہیں اس لیئے بچوں کو اپنے غیر محدود، تغیر پسند، نمو پذیر ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیئے گذشتہ نسلوں کی صدیوں کے تجربات کو سمجھنے کے لیئے ایک "خاص اہتمام" اور طویل مدت کی ضرورت ہے یہی "خاص اہتمام" تعلیم کہلاتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیئے قدرت نے بچپن کا زمانہ جو تعلیم کا بہترین زمانہ

ہے۔ مقابلتہً طویل رکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ منزلِ مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہیں، جتنی وہ آخری منزل۔ اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر کے ہر ہر قدم کو اس کے لئے دلچسپ نہ بنائیں۔ ہم اس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے۔ معلم کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر ایک نو عمر بچہ ایک مخصوص شخصیت کا مالک ہے اور مخصوص شوق اور رجحانات رکھتا ہے جن کا دریافت کرنا اس کا فرض ہے اور جن کی تربیت کے لئے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اس کا خاص فن ہے لیکن استادوں اور والدین نے عام طور پر اس نفسیاتی نکتے کو نظرانداز کیا اور یہی کوشش کی، کہ بچہ فوراً اس بیکار زمانے سے گذر کر سنِ شعور کو پہنچ جائے گویا سنِ شعور کوئی خاص جادو کا دروازہ ہے جس کے اندر قدم رکھتے ہی ناتجربہ کاروں پر زندگی کے تمام اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال یورپ میں صدیوں تک رہا۔ اور بچوں کی لاتعداد نسلوں کو نہایت سخت جسمانی اور ذہنی نقصان ملا۔ روسو Rouseau پہلے انسان تھے جنہوں نے صدائے احتجاج بلند کر کے اس خیال کے خلاف بہت قابلیت کے ساتھ جہاد کیا، اور اس خلافِ فطرت تعلیم کی بنیادیں ہلا دیں۔ انہوں نے بآوازِ بلند کہا کہ خواہ تعلیم کا منتہا کچھ ہو اس کا نقطۂ آغاز معصوم بچے کی ذات ہے جس کی جبلتوں کمزوریوں، اور مخصوص رجحانات کا احترام معلم کا فرض اولین ہے لیکن اس روشنی کے زمانے میں بھی ہمارے ملک کے اساتذہ اور والدین سب کی۔۔ یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح بچہ بہت جلد "بڑھ جاتے" اس کے دماغ میں ہر قسم کی خشک اور دُور از کار معلومات بھر دی جائیں۔ اور وہ کسی دفتر میں یا کسی اور ملازمت میں کام کرنے لگے اس سے بحث نہیں کہ اس کی دماغی ارتقار کس حد تک ہوتی ہے۔ اور اس کا کیا تقاضا ہے۔ بچے کی نشوونما اور اس کی نفسیاتی زندگی سے انہیں کوئی سروکار نہیں، کوئی چاہتا ہے کہ بچہ جلد سے جلد ایک خاص

پیشہ سیکھے خواہ طبیعت اور میلانِ فطری کے لحاظ سے وہ اُس کے لئے موزوں ہو یا نہ ہو۔ کسی کو خواہش ہے کہ اس کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ خواہ فطرت نے اُس کو ان تمام دماغی قویٰ سے محروم رکھا ہو جن کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ بعض اصحاب علوم و ادب کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ وہ براہ راست پیشہ کی تعلیم میں کام نہیں آتے۔ بعض عملی تعلیم کی تمام تحریکوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی رائے عالی میں اعلیٰ تعلیم کے منافی ہیں۔ بعض اس بات پر مُصر ہیں کہ بچوں کو ابتدا ہی سے مذہبی مسائل اور علوم مذہبی یا زبان یعنی عربی اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم دی جائے۔ خواہ بچہ اپنی مادری زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہ ہو اور ان علوم کی اہمیت سمجھنے سے بالکل قاصر ہو۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے ملک کی تعلیم سے کوئی ایک مقصد بھی کامیابی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ نہ وہ افادی ہے نہ تہذیبی اور نہ مذہبی۔

لیکن اگر ہم غور سے بچے کی طبیعت کا رُجحان معلوم کرے اور اسکی مخصوص شخصیت کا جائزہ لیکر اسکو تعلیم دیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیابی کے ساتھ تعلیم کے تمام اعلیٰ مقاصد حاصل نہ کرے۔

داناؤں کا قول ہے کہ اکیلا ایک آدمی دس گھوڑوں کو پانی کے گھاٹ تک لے جا سکتا ہے لیکن دس آدمی مل کر ایک گھوڑے کو بھی زور سے پانی نہیں پلا سکتے۔ اسی طرح اس میں شک نہیں کہ ہم بچے کو آسانی سے مدرسہ میں لے جاسکتے ہیں لیکن یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ بچے کی طبیعت معلوم کئے بغیر اس کے رجحانِ طبع کے خلاف تعلیم دے سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ظاہری دباؤ یا انعام کے ذریعے سے اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کریں گے، اور بظاہر معلوم بھی ایسا ہی ہوگا کہ وہ توجہ سے سنتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوگی۔

چھوٹے بچے باغ کے نازک پودوں کی مانند ہوتے ہیں اگر ان پودوں کے خواص باغبان کو معلوم نہ ہوں اور وہ جس طرح چاہے ان کو باغ میں لگائے تو نتیجہ ظاہر ہے پس اگر باغ کے پودوں پر یہ بات صادق آسکتی ہے اور مالی کے فرائض یہ قرار دیئے جاتے ہوں کہ وہ ان پودوں کے خواص اور اُن کی ضروریات معلوم کرکے ان کے مطابق ان کی پرورش کیا کرتے تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ایک معلم

(انسانی پودوں کا باغبان) انسانی پودوں کی تربیت ان کی طبیعت کے مطابق نہ کرے۔

جب تعلیم کا دارومدار بچے کی طبیعت پر منحصر ہے تو قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے۔ کہ بچے کا عام رجحان طبع کیا ہے اور وہ کون سے طریقے ہیں جن کے ذریعے سے ایک معلم بچے کی طبیعت کا رجحان معلوم کرکے علم کی نعمت غیر مترقبہ سے اس کو مالا مال کر سکتا ہے۔

بچوں کی حرکات اور سکنات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ ایسے مشاغل میں لگ جاتے ہیں جو ان کے لئے دلچسپ ہوں۔ جن میں ان کی قوتوں کا اظہار ہو۔ جن سے ان کو مسرت حاصل ہو معلم اگر ان مشاغل کو سمجھ سکتا ہو۔ اور جانتا ہو کہ آگے چل کر ان کی تکمیل کس شکل میں ہوگی۔ وہ بچوں کے طفلانہ کھیلوں اور ان کے پڑھنے لکھنے میں ان مہتم بالشان مقاصد کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ جن کا حاصل کرنا مدرسے کا انتہائی فرض ہے۔ بچپن میں طلبا کی دلچسپی اور شوق کو تتلی کی طرح ایک جگہ قرار نہیں ہوتا ان کی توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے بچہ اپنی بڑھتی ہوئی شخصیت کے لئے نئے تجربے اس طرح حاصل کرتا ہے کہ کبھی وہ ایک شخص کی نقل اتارتا ہے۔ کبھی وہ دوسرے کی۔ کبھی انجن ڈرائیور بنتا ہے تو کبھی ڈاکٹر۔ کبھی بچوں کو پڑھاتا ہے تو کبھی گھوڑا بن کر ایک خیالی گاڑی کھینچنے لگتا ہے۔ گویا بقول ورڈز ورتھ (Words-worth) اس کا کام یہی ہے کہ ہمیشہ "نیا بھروپ بھرتا ہے"

علاوہ ازیں بچوں کو فطرتاً کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے اور گھر میں اپنی ماں بہنوں کو کہانی سنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ جو کہانیاں ان کے رجحانِ طبع کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان کو سن کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ مدرس اگر اس شوق کو تعلیم کا محور بنا کر انہیں طرح طرح کی دلچسپ کہانیاں سنائے تو بچے اپنی . . . طبیعت کے مطابق خود کتابوں میں کہانیاں ڈھونڈھنے لگ جائیں گے۔ اور ان کی طبیعت کی بنیاد مستحکم ہو جائے گی۔ اور ان میں گویائی کا ملکہ پیدا ہو جائیگا۔ بچے جب عملی کاموں کو خود کرتے ہیں تو وہ قدرتی طور پر بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے معلم اگر طلبا کو ان کے پسند کیے ہوتے کاموں (Occupations) پر لگائے۔ تو ان مشاغل کے دوران میں انہیں اپنے علم

اور واقفیت کو بڑھانے اور ہاتھ سے کام کرنے کا موقعہ ملیگا۔ وہ منصوبے بنانے اور ان کو پورا کرنے کے وسائل سوچنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ مثلاً مدرسہ میں دکان چلانا پوسٹ آفس (Post-Office) قائم کرنا، باغبانی کرنا۔ بچوں کو فطرتاً ایسے کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ان کی بعض اہم جبلتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بالخصوص دو نمایاں نفسی رجحانات یعنی جبلت تعمیر اور جبلت تعاون کو اظہار کا موقع دیتے ہیں۔ اور طلبہ میں کام کرنے کا مادہ اور مسرت اور کامیابی کا احساس پیدا ہوتا ہے اگر معلم ان باتوں کا خیال رکھے تو اسے اپنے شاگردوں کے اندر کئی ایک چھپے رستم ملیں گے، کوئی مدرسہ بھی اقبال مرحوم اور ٹیگور سے خالی نہیں ہوتا۔ الگ بات ہے کہ تربیت پانے سے پہلے معلم ان کی گردنوں پر کند چھریاں پھیر کر ان کو چاہ ضلالت میں گراتے۔

بچے کی طبیعت پر خانگی ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے۔ اگر بچے کی ابتدائی زندگی جلاہوں کی کسی منظم اور محنتی جماعت میں بسر ہوگی تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اس میں اس ماحول کیوجہ سے عمرانی احساس بہت مستحکم ہوگا محنت کرنے کی عادت ہوگی۔ ہاتھ سے کام کرنے میں عار نہ ہوگا۔ لیکن اس خاندان میں اگر تعلیم کا چرچا نہ ہو تو وہ ان خوبیوں کے باوجود تنگ خیال اور تنگ نظر ہوگا۔ اس کی ہمدردی اور مشاغل کا دائرہ محدود ہوگا۔ اور اگر بچہ ایک تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ شخص کے گھر میں پیدا ہو اور جب سے ہوش سنبھالتے ہی زیادہ تر اسی طبقہ کے لوگوں کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے اس کی بول چال اس کے خیالات اس کی طرز زندگی سب پہلے بچے سے مختلف ہوں گے۔ اغلب یہ ہے کہ اس کو ہاتھ کا کام کرنے کی نہ عادت ہوگی نہ شوق بلکہ وہ محنت اور دستکاری کو ذلیل سمجھیگا۔ اور تعلیم ہی کے زمانے میں نوکری کو اپنا مطمح نظر بنائیگا۔ ان مثالوں کے ذریعہ سے ہم نے بتانا یہ تھا کہ مقامی حالات اور روایات بڑی حد تک بچوں کے لباس گفتگو، خیالات مذاق، اور اخلاقی اصول کو بناتے ہیں یا بگاڑتے ہیں۔

معلم اگر مندرجہ بالا امور پر غور کرے اور اپنے دماغ پر زور ڈالے تو کوئی مشکل ایسی نہ ہوگی جس کو وہ حل نہ کر سکے۔ ہم بچے سے یہ توقع نہیں کر سکتے۔ کہ مدرسے کی مختصر زندگی کے دوران میں وہ اس ساری زمین کو کھود کر کاشت کرے جو اس کو زندگی بھر میں درکار ہوگی۔ لیکن ہم مدرسے کی تعلیم کی بدولت

اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت اس کے دماغ میں بیداری، حوصلہ اور جوش اور اس کے دل میں ولولۂ عمل پیدا کریں۔ اور اس کے ہاتھ میں ایسے اوزار دیں کہ وہ آگے چل کر بغیر کسی بیرونی جبر یا انعام یا نگرانی کے جس زمین کو چاہے کھود کر کاشت کرے اور اُسے لہلہاتا ہوا کھیت یا ہرا بھرا چمن بنا دے اور اگر مدرس اتنا بھی نہ کر سکے تو وہ سرے سے اپنے اس کام کو ترک کر دے۔

اقوالِ زرّین

دوسرے کے آنسوؤں کو مسرت بھری نگاہوں میں تبدیل کر دینا بہترین خوش نصیبی ہے

حقیقی کامیابی کام کرنے میں ہے۔

وہ لڑکیاں کس قدر شریر ہیں جو محبوبہ اپنے منتخب عاشق پر ڈالتی ہے۔

وطن کی محبت ایسا جذبہ ہے جس کی بہترین پیمائش ہماری قربانیوں سے ہو سکتی ہے۔

اپنے کان سب کو پیش کرو۔ مگر زبان صرف چند کو۔

بداصل پر اعتبار کرنا بے وقوفی ہے۔

جو عزت کرنا جانتا ہے وہی باعزت بھی ہوتا ہے۔

علم ہی ایک ایسا خزانہ ہے جو نہ چوری کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ تلف ہو سکتا ہے۔

انسان کو ہر حالت میں شکر ادا کرنا لازمی ہے۔

خطرات ہی میں زندگی گذارنے سے آدمی تجربہ کار ہوتا ہے۔

آدمی مرتبہ سے نہیں بلکہ اطوار سے بلند ہوتا ہے۔

آدمی کام سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ باتوں سے

تجربہ کار پر بھروسہ اور کار آزمودہ پر اعتبار کرو۔

دنیاوی شوکت ناپائیدار ہے۔

نوحۂ اقبالؒ

(از مولوی محمد علی صفدرؔ منشی فاضل)

اقبال مرد۔ دولتِ ہندوستان رفت — گویا کہ کوہِ نور زہندوستان رفت
تاب و تواں نماند، دلم داغدار شد — خوں آب گشت و آب چشم اشکبار شد
اقبال تاجدارِ دیارِ سخن نماند — رنگِ وطن نماند و بہارِ وطن نماند
او آفتاب بُد، مہ و انجم بگردِ او — شام و سحر طواف کناں دور و نزدِ او
او از جہاں نمرد، کہ جاوید نامِ او — زندہ است در جہان و مؤثر کلامِ او
اقبال آفتاب، بتابد چوں مشتری — اختر بلند باد! بماند بہ سروری
اقبال بر تو رحمتِ پروردگار باد — جنت مقام و سایۂ آمرزگار باد
اے آنکہ اصلِ خویش نہ دانی، زیاں کنی — راہِ دراز پیش و عمر رائیگاں کنی
دنیا تے دوں نیست بجز کشتِ آخرت — نیکی بدست آر اگر آیدت زدست
غافل مشو بیک دو نفس بیشتر کہ ہست — زادِ سفر بگیر کہ ایں وقتِ فرصت است

صفدر بایں دیار غنیمت شمار عمر
باشد گہے کہ بانگ برآید فلاں بمرد

اقبالؒ

(از سید غلام علی شاہ مظہر متعلم جے وی کلاس ٹریننگ سکول پشاور)

اہل پنجاب کی آنکھیں ابھی تک سر فضل حسین کے سوگ میں تر تھیں اور اُن کی جدائی سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ بقول ظفر علی خان ؎

آتا ہے یگانے کو نہ بیگانے کو چین آج
فردوس کے عازم ہوتے سر فضل حسین آج

واقعی سر فضل حسین پنجاب کا ایک بہت بڑا سرپرست تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے دلوں سے اُن کی یاد ابھی تک نہیں مٹی تھی۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ فلک کج رفتار کی بے موقع حرکت ؎

نہ آیا اور کچھ اس چرخ کو آیا تو یہ آیا
گھٹانا وصل کی شب کا بڑھانا روز ہجراں کا

یعنے پنجاب کیا۔ بلکہ ہندوستان کا اقبال جاتا رہا۔ یہ منحوس دن ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کا تھا کہ تمام ہندوستان کا اقبال جاتا رہا۔ اور سارے ہند میں ایک ہل چل مچ گئی۔ خصوصاً پنجاب اور عموماً ہندوستان کے سرکاری دفاتر بند کئے گئے۔

پنجاب ایک ماتم کدہ بن گیا تھا۔ گھر گھر ماتم اور بین و بکا تھی۔ اور میں کہتا ہوں کہ آج اقبال کی فوتیدگی پر مشرق کیا بلکہ مغرب کو بھی آٹھ آٹھ آنسو رونا چاہیئے۔ کیونکہ اقبال کا کلام مشرق اور مغرب میں یکساں عزیز تھا

"آہ اقبال"

اے اقبال تو صرف جاوید اور آفتاب کا اقبال نہ تھا بلکہ تو صحیح معنوں میں ہندوستان کا اقبال تھا۔ اور اس نامراد ہندوستان کی کئی اُمیدیں آپ کے ساتھ وابستہ تھیں۔

اقبال۔ تیری شاعری نے دنیا میں ایک عظیم الشان تہلکہ مچا رکھا تھا اور تیرے ہر ایک شعر میں ایسی سپرٹ تھی

کہ ہر ہندی نوجوان کو بیداری کا سبق دیا۔

اے اقبال "غالب" اور "ذوق" اگرچہ دنیا سے چل بسے۔ اور "داغ" نے دنیا کو داغ دیا۔ ہر طرف شور اٹھا کہ شاعری کے باغ میں خزاں آئی۔ لوگ نہایت عزت سے اُن کا نام لیتے تھے اور بڑے عرصے تک اُن کی یاد لوگوں کو رُلا رہی تھی۔ لیکن تیرے برسرِ اقتدار ہونے پر باغِ شاعری میں چار چاند چمکنے لگے اور باغ ادب میں از سرِ نو بہار آئی۔ اور ایسی بہار کہ لوگوں کے دلوں سے اِس سے پہلے کی بہاروں کی یاد مٹ گئی اور چاروں طرف سے اقبال، اقبال پکار اُٹھے۔

اقبال میں غالبؔ اور ذوقؔ اور داغؔ کی عزت کو داغ نہیں لگاتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا۔ کہ غالبؔ اور ذوق **تو شاہان** وقت کے دار الخلافوں میں پیدا ہوئے۔ اُن کو شہزادوں کی اُستادی کا شرفِ حاصل ہوا اُس زمانے کا ہر کس و ناکس شہزادوں اور بادشاہوں کی ہمنشینی کی بدولت اُن کی عزت کرتا تھا تو نے ایسا زمانہ نہ پایا۔ مگر عزت اُن سے بڑھ کر پائی۔

اقبال۔ سوائے اہلِ پنجاب کے باقی ممالک کے بچوں نے آپ کو دیکھا تک نہیں۔ لیکن ہندوستان کا بچہ بچہ آج تیری عظمت کا قائل ہے۔ تیرے کلام کا ہر ایک جواہر ریزہ پڑھ کر تجھے شاعروں کا پیغامبر قرار دیتے ہیں۔

اقبال اسلامی نکتۂ نگاہ سے مسلمانوں سے اقبال کا چلا جانا، مسلمانوں کے اقبال کا زوال ہے۔

اقبال دُنیا کی ہر سوسائٹی میں شامل ہونا، سوسائٹی کے لیے باعثِ صد فخر و مباہات تھا۔

اقبال تیرا ہر ایک شعر ہر مسلم کو ملت پروری، اسلامی جوش، اسلام نوازی، خود داری، کا سبق، دیتا تھا

؎ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

آہ اقبالؒ

وائے آں خوش طائرِ باغِ جناں :: وائے آں روح و روانِ ہندیاں
وائے آں کشافِ رمز و نکتہ داں :: وائے آں چشم و چراغِ گمرہاں

صفدر

"اُخُوّتِ انسانی"

(از قلم جناب برزنوش صاحب متعلم جونیئر ورنیکلر کلاس)

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ در آفرینش زیک جوہر اند
تو کز محنتِ دیگراں بے غمی نشاید کہ نامت نہند آدمی

ہم تمام لوگ جو اس دنیا میں موجود ہیں۔ اس قدر مذہب اور دھرم ضرور رکھتے ہیں کہ دیگر اہلِ مذہب کو محبت اور پریم سے دیکھنے کی بجائے حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔

حالانکہ اگر ہم دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر کے غور و فکر سے دیکھیں تو تمام مذاہب کے قوانین اور اصول قریباً قریباً آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ نیکی اور خیرات میں تو قریباً سب یکساں اور برابر ہیں اور نیز مقدس آدمیوں اور کتابوں کے زرین اقوال سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہر فرد بشر کو چاہیئے۔ کہ لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں۔ گویا خداوند تعالیٰ اُس کو دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ زندگی کا بڑا کام خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ لوگ اپنی زندگی کی طوالت کی تو بہت فکر کرتے ہیں۔ مگر زندگی کی اصلاح کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اصلی خوشی اور اطمینان صرف پاک اور نیک زندگی سے اپنی ذات کے لیئے آرام کا فکر کرنے کی بجائے دوسروں کو آرام اور خوشی پہنچانے سے حاصل ہے۔

کم ظرف اور تنگ لوگ ہی پوچھا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہماری قوم یا ذات یا فرقہ کا آدمی ہے یا غیر ہے لیکن فراخ دل یا عالی حوصلہ لوگ تمام بنی نوع انسان کو بھائی سمجھتے ہیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ ہم دیگر مذاہب کی کتب اور مقدس لوگوں کو تعصب کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ورنہ اگر ہم اُن کو محبت اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتے۔ محبت اور شوق سے نہ کہ عیب چینی کے خیال سے اُن کی زندگی اُن کے اقوال اور افعال کا مطالعہ کرتے۔ تو اس قدر باہمی رنجش، نزاع اور اختلاف نہ ہوتا۔

تمام مذاہب بنی نوع انسان سے محبت، خلق اللہ کے ساتھ بھلائی کرنے کی، خیرات کی، علم و ہنر اور کسب سیکھنے کی، صبر و تحمل اور بردباری اور اخوت اور برادری کی تعلیم دیتے ہیں اور اُن کے پیشوا اپنے عمل اور زندگی سے بتا گئے ہیں کہ کس طرح بنی نوع انسان سے محبت کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم سے اکثر اُن کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر دیگر اہل مذاہب کی دل آزاری کرتے ہیں اور اس طرح اپنے پیشواؤں کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا باعث صرف دوسرے کے مذہب سے لاعلمی اور ناواقفیت ہے۔ قدرتاً انسان اُس چیز کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جس کو وہ جانتا نہیں۔ اور سمجھتا نہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی علی الصباح جبکہ آسمان پر ابھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بندوق ہاتھ میں لیکر گھر سے شکار کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں تھوڑی دور ایک خطرناک ڈراؤنی شکل اُس کو نظر آئی۔ اُس نے خیال کیا۔ کوئی بلائے عظیم ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کو بندوق کا نشانہ بنائے مگر ذرا استقلال اور صبر سے کام لیا اور آہستہ بڑھا۔ تو معلوم ہوا کہ انسان ہے جو کہ اُس شخص کو دور سے بلائے عظیم معلوم ہوتا تھا۔ ذرا اور استقلال اور جرأت سے کام لیکر آگے بڑھا۔ اور اُس کو آواز دی کہ کون ہے؟ خدا کی شان دیکھئے۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ اُس کا سگا بھائی نکلا۔ جس کو وہ بلائے عظیم سمجھ کر بندوق کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ بعینہٖ یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو کہ دوسرے مذاہب پر طعنہ زنی کرتے اور اُن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر وہ اُن مذاہب سے سچی واقفیت اور صحیح معلومات حاصل کرتے تو اُن کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ سب اچھی اچھی اخلاقی باتیں ہمارے مذہب کی ہی تو ہیں۔

کیا بہتر ہوتا کہ بحث مباحثے اور دنگا فساد کرنے کی بجائے ہم ایک دوسرے کی کتب مقدسہ کا محبت اور شوق سے مطالعہ کرتے۔ ایک دوسرے کے مقدس بزرگوں کے حالات پڑھ کر واقفیت حاصل کرتے اور بجائے اُن کے نقائص کے اُن کی صرف خوبیاں دیکھتے اور دوسروں کی نکتہ چینی کی بجائے اپنے مذہب کی خوبیاں اپنے نیک طرز عمل سے ذہن نشین کرتے۔

تمام مروجہ مذاہب میں اختلافات ضرور ہیں۔ مگر اختلافِ رائے انسان کا حق موروثی ہے اگر کوئی شخص ہم سے مختلف رائے رکھتا ہے تو ہم کو اُس کے ساتھ ہرگز جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ اُس کو اپنی رائے رکھنے کا ایسا حق حاصل ہے جیسا کہ ہمیں۔

ایک بچے نے اپنے باپ سے نہایت بھولے پن سے پوچھا کہ سب لوگ ایک ہی جگہ میں ایک ہی طرح کیوں خدا وند تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے۔ باپ نے جواب دیا کہ سب لوگ ایک قسم کا کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ اور ایک ہی قسم کے کپڑے کیوں نہیں پہنتے۔ بیٹے نے جواب دیا کہ یہ ہر ایک کی اپنی اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔ جو کھانا وہ چاہے کھائے۔ اور جس رنگ کے کپڑے پہننا چاہے پہنے۔ باپ نے کہا کہ اسی طرح کسی کو کوئی طریقہ خدا وند تعالیٰ کے عبادت کرنے کا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور کسی کو کوئی۔

ہر ایک انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک پہلو میں اُس کا سروکار خدا سے اور دوسرے پہلو میں مخلوقِ خدا سے ہوتا ہے۔ خدا وند تعالیٰ سے جو سروکار ہر ایک انسان کا ہے وہ اُس کا مذہب اور دھرم ہے۔ جس میں وہ اپنی نجات سمجھتا ہے۔ ہمیں اُس شخص کے ساتھ لڑنا نہیں چاہیئے جو کہ مذہبی معاملات میں ہم سے الگ رائے رکھتا ہے اور ہماری رائے کے مطابق غلطی پر ہے۔ بلکہ اُسے محبت اور پیار سے سمجھانا چاہیئے کہ اے میرے پیارے بھائی آپ غلطی پر ہیں۔

اگر ہم کسی دوسرے شخص کو اپنے مذہب کی خوبیوں کا قائل کرنا چاہیں تو سب سے بہتر طریقہ عملی نمونہ ہے۔ کیونکہ بحث مباحثے سے سوائے لڑنے اور رنجش کے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ سچ ہے کہ عمل اور نمونہ زبانی نصیحت کی نسبت زیادہ موثر ہوتے ہیں۔

ہم سب کو چاہیئے کہ غیر مذہب کے مقدس کتب کا مطالعہ کریں۔ جو باتیں مفید اور ضروری ہوں اُنہیں نوٹ کریں اور جن میں اختلاف ہو اُنہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ غیر مذہب کے بزرگوں اور کتب کا نام ادب اور عزت سے لینا چاہیئے۔ اور کبھی اُنہیں بُرے ناموں سے نہیں پکارنا چاہیئے

ایک دفعہ حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو فرمایا جو شخص اپنے

والدین کو گالیاں دیتا ہے وہ کبھی نجات نہیں پائیگا۔ اُن کے ساتھیوں نے فرمایا کہ اپنے والدین کو کون گالیاں دیگا۔ فرمایا وہ شخص جو دوسروں کو گالیاں دیتا ہے۔ اُسی طرح جواب میں اپنی ماں اور باپ کی گالیاں سنتا ہے۔

جو لوگ خداوند تعالیٰ کے سوا بتوں یا کسی اور چیزوں کی پرستش اور عبادت کرتے ہیں اور ان چیزوں کو اپنے خیال میں معبود اور خدا سمجھتے ہیں تو اُن چیزوں کو بھی گالیاں نہیں دینی چاہئیں۔ کیونکہ اس کے عوض میں وہ خدا تعالیٰ کو گالیاں دینگے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎ حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

اَلْمُلْکُ لِلّٰہ

طارق چوں بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطا است

دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست

خندید دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

(اقبال رح)

"ٹریننگ سکول میں صنعتی مشاغل"

ہمارے سکول میں جو صوبہ بھر میں واحد اجتماعی درسگاہ ہے۔ ورنیکولر مدرسین کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں مندرجہ ذیل صنعتی مشاغل سے بھی بہرہ ور کیا جاتا ہے:۔

ہمارے کرمفرما جناب شفق صاحب صدر المعلمین شبانہ روز طلاب میں اپنے مؤثر اور مفید لیکچروں کے ذریعے یہی سپرٹ بھرتے ہیں۔ کہ موجودہ دور میں کشمکش حیات میں کامیابی کے لئے صنعت و حرفت، تجارت زراعت، وغیرہ وغیرہ پیشوں سے کماحقہٗ آگہی اور واقفیت حاصل کر کے اپنی روزی کی سبیل پیدا کرنا از بس لازمی و لابدی ہے۔ کیونکہ آپ بخوبی جانتے ہیں۔ موجودہ تعلیم یافتہ حضرات فارغ التحصیل ہو کر تعداد بیروزگاران میں ہر سال اہم اضافہ کر رہے ہیں جس سے ملک میں کساد بازاری، غربت و ناداری کا دور دورہ ہے اندریں حالات یہ ضروری ہے کہ ملک میں صنعتی، زراعتی اور تجارتی مدارس قائم کر کے عوام کو روزی کمانا سکھایا جائے۔ صاحب موصوف کا انتہائی مقصد یہ ہے کہ ہر ایک تعلیم یافتہ فرد محض موجودہ تعلیم کو ذریعہ روزی نہ سمجھے۔ بلکہ صنعت، دستکاری، تجارت وغیرہ کی بدولت اپنا پیٹ پال سکے۔ چنانچہ آپ نے اپنے اس نقطۂ نگاہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے سکول میں صنعتی و زرعی مشاغل کا باقاعدہ مہتم بالشان اجرا کر دیا ہے۔

۱:۔ جلد ساز کلاس

جناب مولوی صدر الدین صاحب فسٹ پرشین ٹیچر کی زیر نگرانی یہ کلاس کام کر رہی ہے۔ بیس طالب علم اس کلاس میں داخل ہیں۔ ساڑھے پانچ بجے بعد دوپہر سے چھ بجے تک تقریباً ایک گھنٹہ ہر روز کام کے دن جلد سازی کی جاتی ہے۔ مولینا صاحب نہایت قابل، شریف اور دیانتدار آدمی ہیں وہ دل سے چاہتے ہیں۔ کہ ہر ایک طالب علم جلد سازی میں بہت جلد ماہر ہو جائے۔ چنانچہ صرف ایک ماہ کام کرتے ہوئے طالب علموں نے دو تین قسموں کی جلد باندھنا سیکھ لیا ہے جو کہ عام طور پر بازاروں میں جلدساز جلدی اور دفع الوقتی کی خاطر کیا کرتے ہیں۔ اب بتدریج نہایت اعلیٰ

طریق پر عمدہ قسم کی جلد باندھنا سکھایا جاویگا۔ جس طریق پر انگریزی جلدیں باندھی جاتی ہیں۔ اُمید اغلب ہے کہ عنقریب ہر قسم کی جلد سازی سے وہ آشنا ہو کر اپنی روزی کما سکیں گے۔

۲۔ پینٹنگ کلاس :۔

اس کلاس میں سب طالب علم حصہ لیتے ہیں۔ جنہیں جناب مکرمی ہیڈ ماسٹر صاحب بذات خود کام کراتے ہیں۔ یہ کام ابھی حالتِ طفلی میں ہے۔ اُمید ہے کہ طلباء جلد ہی ہر قسم کے سائن بورڈ وغیرہ کا کام حسن و خوبی سے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ آج کل یہ پیشہ شہروں بلکہ قصبوں میں بھی کام دے سکتا ہے۔ اور روزی کمانے کا ایک مکمل ذریعہ ہے۔

۳۔ صابون سازی اور پالش بنانا

تمام طلاب کو صابون اور پالش بنانا جناب خواجہ محمد سلیمان صاحب سیکنڈ ماسٹر سکھاتے ہیں اور اُن سے پریکٹیکل کام کراتے ہیں۔ اب ہر ایک طالب علم خود ہی صابون اور پالش بنا سکتا ہے اور خود ساختہ اشیاء کو استعمال کر کے فائدہ حاصل کر سکتا ہے موجودہ وقت میں یہ دونوں کام نہایت ضروری ہیں۔ کیونکہ ملک میں ان چیزوں کی مانگ ہے۔ اور بہت کھپت ہو رہی ہے۔ اس واسطے مستقل ذریعہ معاش اختیار کرنے کا معقول ذریعہ ہیں۔

۴۔ مصوّری

فوٹو گرافی کا کام جناب ڈاکٹر محمد جان بی، ایچ ڈی" کی نگرانی میں نہایت عمدگی سے ہو رہا ہے اس فن سے میلان طبع رکھنے والے طلبہ نہایت شوق سے حصہ لے رہے ہیں۔ اس فن کی اہمیت بھی ظاہر ہے کہ آج کل اس سے کس قدر فائدہ اُٹھایا جانا ممکن ہے۔

۵۔ چٹائی بافی :۔

یہ کام جناب خان غلام سرور خان کی نگرانی میں شروع کیا گیا ہے جن علاقوں میں چٹائی کے پتے پائے جاتے ہیں۔ وہاں کے مکین طلباء کے لئے یہ کام بہت مفید اور اچھا ذریعہ معاش ہے بشرطیکہ وہ صدق دل سے کام شروع کرتے ہوئے ہمیشہ کے لئے جاری رکھیں۔

مندرجہ بالا صنعتی مشاغل کے علاوہ تمام طالب علموں سے زراعت و باغبانی نہایت سائنٹیفک طریق سے کرائی جاتی ہے۔ یہ کام جناب خان غلام سرور خاں کے مفید مشوروں اور حسن عمل کا رہین منت ہے ہر ایک طالب علم کو سکول کے نواح میں پلاٹ دیئے گئے ہیں۔ جن میں اُسے روزانہ کام کرکے پھول پھلاری اور پودے لگانے پڑتے ہیں۔ اور باقاعدہ روزانہ مشاہدہ کرکے روزنامچہ میں مندرجہ ذیل امور درج کرنا پڑتے ہیں۔ پودے کس طرح نشو ونما پاتے ہیں۔ بیج کب پھوٹ آتا ہے۔ کسی پودے کے لئے کیسی زمین مفید ہے۔ کھاد کب ڈالی جائے۔ نیز کھاد کس طرح تیار کی جائے۔ پانی کب دینا چاہئیے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جی کھول کر یہ کام نہیں ہوسکتا۔ یہ علاقہ بنجر ہے پانی وغیرہ زراعت ہونی ناممکن اور امر محال ہے۔ یہاں تمام سکول کے لئے نہر سے صرف آدھا انچ پانی دیا جاتا ہے۔ جس سے تمام کاموں کو پورا کرنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی سکول کے پاس دیکھئے۔ گونا گون اور بوقلمون پھولوں کی خوشبو انسان کو معطر کر دیتی ہے۔ نظر خیرہ اور پریشان ہوجاتی ہے کہ کس طرف سے طراوت اور تازگی حاصل کرے۔

بالآخر میں یہ عرض کروں گا کہ چونکہ ہمارا صوبہ کیا بلکہ تمام ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے صنعت دستکاری، تجارت وغیرہ پیشوں میں بہت قلیل آبادی کا انحصار ہے۔ عموماً ذریعہ معاش زراعت ہے لیکن افسوس ہے کہ اب تک کاشتکاروں کی دقیانوسی حالت نہیں بدلی۔ اور نہ زراعت سے جدید آلات وحالات کے مطابق کما حقہٗ فائدہ اٹھانے کی طرف ترغیب وتحریص دی گئی ہے ہر ایک مصلح اور بہی خواہ وطن کو اس پیشہ کو معراج کمال پر پہنچانے کی کماحقہٗ کوشش کرکے اپنے بھائیوں کی فلاح وبہبود کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جو دارین میں موجب سعادت و ثواب ہوسکے۔

(ادارہ)

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

(اقبالؒ)

باپ کے نام

ہمیں ایک تعلیمیافتہ نوجوان کے پرائیویٹ خطوط دستیاب ہوئے ہیں اور چونکہ اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں جو کہ ہم سب کیلئے مفید ہیں۔ اس لئے ناظرین مشعل سرحد کی تفنن طبع اور اصلاح کی خاطر ایک خط شائع کیا جارہا ہے اور باقی خطوط آیندہ اشاعتوں میں سلسلہ وار شائع کئے جائینگے۔ (ادارہ)

پشاور ۱۲ مئی ۱۹۴۸ء میرے پیارے باپ

السلام علیکم۔ دو روز ہوئے عبداللہ خاں یہاں آیا تھا۔ اور اس نے ذکر کیا کہ آپ گاؤں میں مدرسہ کھلنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس نے آپ کے تمام دلائل سے مجھے آگاہ کیا۔ آپ کی بدگمانیوں کا تو کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اگر ان تمام دلائل کو غور سے دیکھا جائے۔ تو ان میں کچھ اصلیت نظر نہیں آتی۔

آپ کا یہ خیال کہ تعلیم بچے کو گھر کے کام کاج کا نہیں رہنے دیتی بالکل خام اور بے معنی ہے مدرسہ تو صرف بچے کو اطاعت اور خود داری سکھاتا اور اس کے ذہن کو روشن کرتا ہے۔ بچہ اگر برباد ہوتا ہے تو والدین کے بے جا لاڈ و پیار سے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین سکول جانے والے بچے سے کوئی کام نہیں نہیں لیتے۔ اور یہی امتیاز اس کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض کہ تعلیم یافتہ بچہ اپنے زمیندار باپ کے لئے بالکل غیر مفید ہے نہ وہ ہل جوت سکتا ہے۔ اور نہ بیائی اور کٹائی میں مدد دے سکتا ہے۔ سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ بچہ کا یہ کاہلی اور کمزوری غلط عادت کی وجہ سے ہے۔ جسکی سراسر ذمہ داری والدین کے سر عائد ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ بچہ اپنے زمیندار باپ کو نت نئی زرعی تجاویز سے واقفیت دلا سکتا ہے جسکو استعمال میں لا کر ان کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ اس کے تحریری لین دین میں اس کو بہت سی فریب کاریوں سے بچا سکتا ہے۔

آج کل کے زمانے میں تعلیم سے دُور بھاگنا اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے کیونکہ زمانہ اس تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ اگر ایک قدم پیچھے رہ جائے تو تا قیامت نہیں مل سکتا حضرت ہمایون نے خوب کہا ہے۔

"اور فائدہ کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم ساہوکار کے پنجوں اور فریب کاریوں سے بہت حد تک نجات حاصل ہو سکیگی۔ ہم بغیر سوچے سمجھے تحریری لین دین کرتے ہیں۔ انگوٹھے لگاتے ہیں اور جب پھنس جاتے ہیں۔ تو پھر اپنی بدقسمتی پر روتے ہیں کہ افسوس ہم تعلیم یافتہ نہ تھے ورنہ یہ مصیبت تو نہ آتی۔"

اس سلسلے میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ للہ مدرسے کی مخالفت نہ کریں۔ بلکہ اُس کی موافقت میں کوشش کریں۔ تاکہ ہماری آیندہ نسلیں بہت سی مصیبتوں سے جو کہ آئے دن ہم لوگوں کو پیش آتی رہتی ہیں۔ نجات مل جائے۔

والدہ صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام عرض کردیں۔ عزیزان نسیم اور امین کو پیار۔

آپ کا تابعدار فرزند

سلیم خاں

رُباعی

قفا خوریم ملامت کشیم خوش باشیم   کہ در طریقتِ ما است کافری رنجیدن

بہ پیرِ میکدہ گفتم کہ چیست راہِ نجات   بخواست جامِ مئی گفت عیب پوشیدن

(حافظ شیرازیؒ)

علم الالسنہ اور اردو

علم الالسنہ :- یورپ کا دعویٰ ہے کہ گو علم اللسان محدود طور پر قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اور یونانی فلاسفروں نے بھی زبان کی ابتدا پر اپنے رنگ میں بحثیں کی ہیں۔ لیکن پرانے زمانے میں اگر کوئی کتاب اس علم کے متعلق قابل قدر ہے۔ تو وہ سنسکرت فاضل نیپینی کی گرائمر ہے۔ جس نے سنسکرت کی گرائمر ایسی مکمل لکھی ہے کہ اس کی مثال نہ صرف قدیم ایام میں بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ دعویٰ یقیناً مبالغہ آمیز ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علم الالسنہ کے اکثر محققین عربی زبان سے بالکل ناواقف تھے، ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ عربی زبان کے مشہور فاضل ابوعلی فارسی نے اشتقاق کبیر کا مسئلہ دنیا کے سامنے پیش کر کے علم اللسان کو اسی صورت میں پیش کیا ہے جس صورت میں کہ اس وقت یورپ کے محققین اسے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ابوعلی فارسی اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے اور یہ لوگ ناکام رہے ہیں۔ یہ ابوعلی فارسی ہی ہے جس نے تیسری صدی ہجری میں اس سوال کو اٹھایا ہے کہ زبان الفاظ سے نہیں شروع ہوتی بلکہ حروف اور حرکات سے، یعنے جس طرح مخلوق کی ابتدا انسان سے نہیں بلکہ باریک غیر مرئی ذرہ سے ہے۔ اسی طرح زبان کی ابتدا الفاظ سے نہیں بلکہ آ۔ او۔ ای اور حروف سے ہے۔ لفظ مفرد معنی نہیں دیتا۔ بلکہ مرکب معنی دیتا ہے۔ مفرد معنی جن کا مبدا انسان کے طبعی احساسات ہیں حروف اور حرکات سے شروع ہوتے ہیں اور وہی زبان کی ماں ہیں۔ یورپ اس وقت ترقی کر کے اس نقطہ سے آگے نہیں بڑھا اور اگر کسی وقت اس کے پرجوش محقق اس سے آگے نکلے ہیں۔ تو اگلی نسل نے انہیں علمی دیوانہ قرار دیکر تحقیق کو پھر نیچے سے شروع کیا ہے۔ افسوس! ابوعلی فارسی کی یہ کتب محفوظ نہیں رہیں۔ لیکن اس کے شاگرد زبان کے مشہور عالم ابن جنی نے اپنی کتب میں جو کچھ ان کی تحقیق کے متعلق لکھا ہے وہ اصول کے سمجھنے اور ان پر نئی بنیاد رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح زبان کے مشہور عالم سکاکی نے اپنی کتاب مفتاح العلوم میں جو اپنے استاد الحاتمی کی نسبت اشتقاق اکبر کا قاعدہ منسوب کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ابوعلی فارسی نے جو کام شروع کیا تھا۔ اُسے الحاتمی نے جو پانچویں صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ کمال تک

پہنچا دیا لیکن افسوس کہ اس کے بعد انحطاط کا زمانہ شروع ہو گیا اور اُن علوم کو ترقی دینا تو الگ رہا انہیں محفوظ رکھنا بھی مسلمانوں کے لیئے مشکل ہو گیا لیکن بہرحال یہ امر کتب صرف و نحو سے ثابت ہے کہ انہوں نے فارسی ہی نے درحقیقت علم اللسان کی بنیاد رکھی اور ایسے اصول وضع کیئے ہیں کہ جن کی مدد سے زبان کی ابتدا کا مسئلہ خوب سمجھ میں آسکتا ہے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ مغربی محققین کے نزدیک علم اللسان کی ابتدا پینینی سے ہوئی ہے۔ جس نے گرامر پر بہترین کتاب لکھی ہے۔ یونانیوں نے بھی اس عنوان پر کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ مغربی محققین کے نزدیک مستند نہیں۔ اور مغربی حکماء نے سترہویں صدی میں اس شعبہ کو علمی حیثیت سے مطالعہ کرنا شروع کیا تھا

تحقیقات کا خلاصہ:۔ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ یہ دعویٰ یورپ کا درست نہیں، اس موضوع کی تمام شقوں پر مسلمانوں نے بحثیں کی ہیں۔ لیکن اخلاف نے اسلاف کے خزانوں کو ضائع کر دیا مگر اس بحث میں پڑنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت میں علم اللسان جسے مغربی اصطلاح میں فلالوجی کہتے ہیں۔ اس کے متعلق موجودہ تحقیق کا خلاصہ بیان کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اُردو کے ادیب اس کے متعلق کیا خدمت کر سکتے ہیں اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوں گے۔؟

علم اللسان کی ابتدا درحقیقت اس خیال سے ہوئی ہے کہ بعض مذاہب نے اپنے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ ابتدائے عالم سے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے بڑے بڑے مذہب تین ہیں۔ ایرانی مذہب، ہندو مذہب اور یہودی مذہب۔ اسلام نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ابتدائے خلق سے اس کا وجود مختلف صورتوں میں دنیا میں موجود رہا ہے۔ اس وجہ سے مسلمانوں نے چودھویں صدی سے پہلے اس نظریہ سے اس علم کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن بقیہ تین مذاہب کا دعویٰ ہے کہ ابتدا سے کلام الٰہی ان کی زبانوں محصور رہا ہے اس وجہ سے قدرتاً انہیں اس طرف توجہ ہونی چاہیئے تھی کہ دلائل عقلیہ سے یہ امر ثابت کریں کہ ان کی زبان سب زبانوں کی ماں ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ زرتشتیوں نے عملاً اس طرف کیا توجہ کی، لیکن ہندوؤں اور تورات کے ماننے والوں نے اس طرف توجہ کی اور

ہندؤوں میں چونکہ علمی انحطاط شروع ہو چکا تھا ان کی کوششیں آریہ سماج کے چند دعووں سے آگے نہیں نکلیں۔ لیکن مسیحی چونکہ گذشتہ صدیوں میں اپنے شباب کے زمانہ میں سے گذرے ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر خاص زور دیا ہے۔ اگر لیبنیز کی تحریرات کے زیر اثر اٹھارویں صدی میں فلالوجی یا علم اللسان کے متعلق زیادہ آزاد تحقیقات شروع نہ ہو جاتی۔ تو اُن کا دعویٰ ضرور قائم رہتا مگر ان لوگوں نے زیادہ تر مختلف زبانوں کی بناوٹ کے حسن و قبح پر بحث کی اور علم اللسان کے ان شعبوں پر بحث نہیں کی جن پر آجکل کی جاتی ہے۔

اشتراکِ السنہ اور اس کا ردِ عمل:۔ اٹھارہویں صدی مسیحی میں بعض سنسکرت کے ماہر مستشرقین کی توجہ اس طرف پھری۔ کہ سنسکرت اور لاطینی زبانوں میں مشابہت پائی جاتی ہے اور اس خیال کے پیدا ہونے پر علم اللسان کا یہ نیا باب کھلا کہ زبانوں کے مختلف سلسلے ہیں۔ ہر سلسلہ کی زبانیں آپس میں شدید اتحاد رکھتی ہیں اور یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہر ایک سلسلہ کی زبانیں ایک مشترک منبع سے نکلی ہیں۔

اس تحقیق کا صرف یہی علمی نتیجہ نہیں نکلا کہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو گئی کہ مختلف زبانیں بظاہر مختلف ہوتے ہوئے بھی آپس میں مشابہت تامہ رکھتی ہیں بلکہ ایک سیاسی تغیر بھی اس سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ یورپین لوگوں کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہندوستان اور اس کے قدیم علوم کی طرف اُن کو بہت توجہ ہو گئی۔ اس تحریک کے ماتحت پروفیسر میکسمولر نے قدیم سنسکرت علوم کے خزانے پوشیدہ غاروں سے نکال کر دنیا کی علمی مجالس میں بکھیر دیئے اور اس رَو کا نتیجہ تھا کہ مسز بیسنٹ جیسی لسّان اور محنتی خاتون اپنا ملک چھوڑ کر ہندوستان میں ہمیشہ کے لیئے آ بسی اور اور اپنی قومیت کو بھلا کر ہندو سوسائٹی کا جزو بن گئی۔ آج جرمنی کے تغیرات میں بھی اس خیال کی جھلک پائی جاتی ہے۔ آرین تہذیب کے قیام کا خیال درحقیقت اس قسم کی تحقیقات کے نتیجہ میں جرمن قوم کے دل میں پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں اور یہودیوں سے دشمنی بھی درحقیقت انہی خیالات کا لازمی نتیجہ ہے۔ مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ یہ خیال درست ہے یا نہیں۔ لیکن میں صرف اس طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ کہ ایک بظاہر سادہ علمی جستجو اپنے نتائج میں کتنی عظیم الشان

مؤثر اور خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

زبان کی ابتداء :- اِس اردو کے محققین علم اللسان کا یہ خیال تھا کہ شروع میں زبان سادہ ہوتی تھی اور سادگی سے وہ یہ معنے لیتے کہ وہ بہت ہی مختصر ہوتی تھی۔ اُن کے نزدیک شروع میں انسان اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے صرف ایک مختصر آواز نکالتا تھا جو شاید ابتداء میں صرف آ، ای، او، اے وغیرہ آوازوں پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد بولتے بولتے بعض حروف صحیح بعض کی زبان سے نکلے اور زبان کا جزو بنتے چلے گئے۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ شروع میں دو حرف سے زیادہ کے الفاظ نہیں ہوتے ہوں گے۔ اور اس خیال کے ماتحت وہ سمجھتے تھے کہ جس زبان میں مختصر الفاظ ملیں وہی پہلی زبان ہے۔ اس خیال کے ماتحت بعض نے تو سنسکرت کو پہلی زبان قرار دیا لیکن اکثر نے کہا کہ اصل زبان مفقود ہو گئی ہے۔ اور اس کی پہلی بیٹیاں سنسکرت، پہلوی یعنی ایرانی اور لاطینی تین زبانیں ہیں۔

ان لوگوں کی زیادہ تر بحث یہ ہوتی تھی کہ یہ بتائیں کہ زبان کس طرح بنی اور زبانوں کا سیدھا سادا اشتراک ثابت کرنے کے بعد یہ لوگ اپنا اکثر وقت اس امر میں ہی صرف کرتے تھے۔ کہ انسان کو زبان کا خیال کس طرح پیدا ہوا اور زبان کی ابتداء کس طرح ہوئی۔

بعض جرمن محققین نے علم اللسان کی بحثوں میں یہ جدت بھی پیدا کی۔ کہ مختلف زبانوں اور مختلف الفاظ سے مختلف قوموں کے اخلاق کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور اس پر تفصیلی کتب لکھیں۔ لیکن دنیا نے انہیں ایک علمی مشغلہ سے زیادہ نہیں سمجھا۔ اور شاید یہ علم منجمد صورت اختیار کر لیتا۔ اگر بعض محققین پرانی تحقیقات کو سرے سے باطل کر کے ایک نیا خیال پیدا نہ کر دیتے اس خیال کی تکمیل کا سہرا مسٹر اوجسپرسن کے سر ہے۔ جنہوں نے زبانوں کی تحقیق کرنے کے لئے بجائے اوپر سے نیچے کی طرف آنے کے نیچے سے اوپر کی طرف جانا چاہئے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ جو چیز ہمیں معلوم نہیں۔ اس کے متعلق ہم جو کچھ خیال دوڑائیں گے۔ قیاسی ہو گا لیکن جبکہ ہمارے سامنے ہزاروں زبانیں موجود ہیں۔ کہ جو شکل ان کی آج ہے دو تین سو سال پہلے ان کی وہ شکل نہ تھی تو کیوں ہم زبانوں کی تاریخ کے اس حصہ سے جو پوری طرح ہماری نظروں کے سامنے ہے اپنی تحقیق کی ابتداء کیوں نہ

کریں۔ چنانچہ انہوں نے اصل کے ماتحت زبانوں کا مطالعہ از سرِ نو شروع کیا اور یہ عجیب بات معلوم کی کہ ابتداء میں بجائے الفاظ چھوٹے ہونے کے بڑے ہوتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس وقت انسان کو ابھی بولنا نہیں آیا تھا۔ اس وقت جب کبھی اس کے دل میں جذبات جوش مارتے تھے۔ تو حرکات کے ساتھ ساتھ اس کے منہ سے کچھ آوازیں بھی نکل جاتی تھیں۔ چونکہ اُن کے معنی اس وقت کوئی نہ ہوتے تھے۔ اس لئے اپنے دل بہلانے کے لئے وہ اُن آوازوں کو دُہراتا اور گیت کی طرح لمبا کرتا تھا تاکہ سننے میں خوش گوار ہوں آہستہ آہستہ اپنی آوازوں کو اس نے جوڑنا شروع کیا۔ اور بعض معانی کے الفاظ بن گئے۔ جو آہستہ آہستہ چھوٹے ہو گئے۔ اور موجودہ زبانوں کی شکل اختیار کر گئے۔

زبان الہاماً سکھائی گئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ مختلف خیالات درست ہیں لیکن ان سے جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ محض ڈھکوسلے ہیں اور ظن سے زیادہ اُن کی قیمت نہیں۔ اصل حقیقت ان سب خیالات کے بین بین ہے۔ اور وہی درحقیقت ہماری راہنمائی کا موجب ہو سکتی ہے۔ ایک بھی نظریہ نہیں کہ جسے پوری طرح علم اللسان کی حقیقت کے واضح کرنے کا موجب سمجھا جائے۔ اور اسی وجہ سے بعض محققین دوبارہ اس پرانے خیال کی طرف رجوع کر رہے ہیں کہ زبان درحقیقت انسان کو الہاماً سکھائی گئی تھی اور براہ راست خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ڈبلیو شمڈت مشہور محقق السنہ نے سب خیالات کو چھوڑ کر آخر اسی خیال کو اختیار کر لیا ہے۔

زبان کی ابتداء کی نسبت تو میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ الہامی تھی۔ خواہ وہ الہام خفی ہو یا جلی۔ لیکن باوجود اس امر کے تسلیم کر لینے کے کہ ابتدائی زبان الہاماً سکھائی گئی تھی۔ پھر بھی علم اللسان کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ بے شک اس خیال کو تسلیم کر کے کہ زبان کی ابتداء الہام سے ہوئی۔ اس بحث سے تو نجات ہو جاتی ہے کہ انسان کو زبان بنانے کا خیال کس طرح آیا۔ اس نے الفاظ کس رنگ میں بنانے شروع کئے، اور حروف صحیح پہلے بنے یا حروف علت سے زبان شروع ہوئی۔ لیکن یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے۔ کہ وہ کونسی زبان تھی جو الہام کی گئی۔؟

اس امر پر تو غالباً ہر مذہب کے لوگ آسانی سے متفق ہو جائیں گے کہ ابتدائی زبان انسان کو الہامی طور

پر ملی تھی۔ لیکن اس امر پر دنیا کا متحد ہونا ناممکن ہے کہ وہ کونسی زبان تھی جو الہام ہوئی تھی اور پھر اس زبان سے یہ مختلف زبانیں کس طرح بن گئیں۔

اگر زبان کو الہامی نہ مانا جائے۔ تب بھی اس ظنی بحث کے علاوہ کہ ابتدائً زبان کس طرح بنی۔ یہ سوال الہامی زبان کے منکروں کے لیئے بھی کم اہم نہیں۔ کہ زبان خواہ کس طرح بھی بنی لیکن یہ امر یقینی ہے کہ سب زبانیں مستقل طور پر ایجاد نہیں ہوئیں۔ پس موجودہ زبانوں میں سے جو قدیم زبانیں ہیں اور جن کی ابتدا کی تاریخ سے ثابت نہیں۔ اُن میں سے کونسی زبانیں مستقل ہیں۔ اور کونسی زبانیں دوسری زبانوں سے مشابہ ہیں۔ اور پھر یہ کہ مشابہ زبانوں میں سے کونسی زبان اصل ہے اور کونسی فرع، کون سی ماں ہے اور کون سی بیٹی یا یہ کہ ماں کوئی بھی نہیں سب بہنیں ہیں۔

ان سوالوں کا حل صرف ایک خالص علمی تحقیق ہی نہیں کہلائیگا بلکہ یقیناً ان سوالوں کے حل سے انسانی تمدن، انسانی تاریخ، مذہب اور سیاست پر بھی بہت سی روشنی پڑیگی اور میرے نزدیک بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیگی۔ مثلاً کئی قومیں جواب ادنیٰ کہلاتی ہیں۔ بالکل ممکن ہے۔ علم الالسنہ کی تحقیق سے اُن کی تاریخ بالکل بدل جائے اور ذلیل کرنیوالی قوم کی نسلی لحاظ سے وہ اصل یا ماں ثابت ہو۔

میں بتا چکا ہوں کہ مسٹر اوجسپرسن نے اس امر پر زور دیا ہے کہ موجودہ زبانوں کی تاریخ ہمیں پرانی زبانوں کی تحقیقات میں زیادہ مدد دے سکتی ہے اور میرے نزدیک یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا اصول ہے۔ جسے نظر انداز کر کے پہلے محققین بھٹکتے پھرے ہیں۔ پرانی اور نئی تحقیق میں بالکل وہی فرق ہے۔ جو پیدائش عالم کے متعلق نئے اور پرانے فلسفہ میں ہے۔ پرانے لوگ محض اپنی عقل سے دنیا کی پیدائش کا قانون معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ نئے ماہرین ہیئت ان ستاروں کی تخلیق پر غور کر کے جو اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے تیار ہو رہے ہیں گذشتہ کا قیاس کرتے ہیں گو دونوں ہی ظن پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں۔ لیکن اس میں کیا شک ہے کہ ایک کا ظن اور خیال اصول پر مبنی ہے۔ اور دوسرے کا ظن اور خیال بھی بے بنیاد ہے (باقی آئندہ) (ماخوذ از المبشر)

NATIONALISM

نیشنلزم

(از قلم فقیر محمد الفت متعلم جے وی کلاس)

دنیا کی ترقی کا دارومدار انسانی تجربات کی کامیابی پر ہے۔ زندگی کے لیئے جدوجہد کے طریقے انسانی دماغ کے مخترعات ہیں اور ایسا ہر طریق بموجب حالات بنی نوع انسان کو عناصر قدرت کے عمل اور انسان کی اپنی فطری بہیمیت سے محفوظ رکھتا ہے۔ تسخیر قدرت کا مطلب قوانین قدرت کی دریافت سے قدرت کو رام کرنا اور پھر اس کی مدد سے بقا حاصل کرنا ہے۔ سائنس کی اصلی غرض وغایت بھی تسخیر قدرت ہے۔ جہاں انسانی زندگی کو عناصر قدرت کی طرف سے خطرہ ہے وہاں اس کو انسان کی فطری حیوانیت سے کچھ کم خطرہ نہیں ہے۔ اسی خطرہ سے نجات حاصل کرنے کی خاطر جماعتی نظام قائم ہوا۔ اور جماعت کے افراد کو مجلسی حقوق عطا کئے گیئے۔ جن سے چند فرائض بصورت اوامر ونواہی خود بخود اُن پر عائد ہوگیئے۔ سوسائٹی (Society) کے زمانہ طفولیت میں یہ حقوق مختلف قبیلوں اور گروہوں میں عوائد رسمیہ کے طور پر جاری رہے۔ لیکن سوسائٹی جب شاہراہ ترقی پر ذرا اور آگے بڑھی تو مختلف قبیلوں نے مل کر اپنی حفاظت کے لیئے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی۔ بعد ازاں اس جماعت کو قیام امن کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ان عوائد رسمیہ کو قانون کی شکل دی گئی یہ مقصد یہ تھا کہ جب جماعت کے افراد کے درمیان . . . حقوق یا فرائض کے بارے میں کسی قسم کا جھگڑا پیدا ہو تو اصل رسم ورواج کے متعلق اختلاف رائے پیدا نہ ہو سکے۔ اور توقف یا تضیع اوقات کے بغیر قانونی چارہ جوئی کی جاسکے۔ لیکن اگر ایک جماعت کے افراد کی زندگی اُن کے اپنے ہاتھوں میں غیر محفوظ ہو سکتی ہے۔ تو اس جماعت کی ہستی کسی دیگر ہمسایہ جماعت کی موجودگی سے بھی معرض خطرہ میں پڑ سکتی ہے اجتماعیات کی وہ شاخ جس سے ایک جماعت اپنی ہمسایہ جماعت کی دست برد سے نیز اندرونی تفرقات (differences) سے مصئون و مامون رہ سکتی ہے۔ علم سیاسیات (Politics) کہلاتی

ہے۔ جہاں انسانی تجربہ نے علم کی اور راہیں کھولیں۔ وہاں سیاسیات نے بھی ترقی کی اور سیاسی تجربے کی بنا پر اقوامِ عالم بتدریج شاہراہِ ترقی پر گامزن رہیں۔ حتیٰ کہ حکومت کے کئی نظام معرضِ وجود میں آ گئے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور دو ہی ہیں۔ ایک ملوکیت، دوسرا جمہوریت۔ ان ہر دو نظام ہائے حکومت کے ماتحت چند اور ذیلی نظام ہیں۔ عام طور پر قرونِ وسطیٰ سے پیشتر اور بعد ازاں بھی انیسویں صدی تک جابرانہ ملوکیت کا دور دورہ رہا۔ انیسویں صدی میں جمہوریت کو فروغ ہونا شروع ہوا۔ اور مطلق العنان حکومتوں کے تختے اُلٹنے شروع ہوئے۔ جمہوریت کی تحریک سب سے پہلے یورپ میں شروع ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ یہ نیشن (ملت) کا خیال تھا، یہ انیسویں صدی میں انقلاب فرانس نے اس خیال کو مزید تقویت دی۔ چنانچہ تھوڑے سے ہی عرصے میں اس کو عام قبولیت نصیب ہوئی۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ انیسویں صدی کی پیدائش تھا تو ہمارا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پیشتر دنیا میں یہ خیال موجود ہی نہ تھا

دنیا میں اس سے پہلے بھی نیشن (Nations) موجود تھے اور وہ نیشنل (ملی) حیثیت میں اپنی جداگانہ خصوصیتوں اور سرگرمیوں کے باعث ایک دوسرے سے ممیز تھے۔ ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس سے پیشتر یہ جذبہ دنیا میں نمایاں طور پر کارفرما نہیں ہوا تھا اور اسے انیسویں صدی میں جو مقبولیتِ عامہ حاصل ہوئی وہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس جذبہ کی تخلیق و تربیت جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یورپ میں ہوئی اس سے پہلے دنیا بھر میں ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ ممالک اور ان کے باشندے بادشاہوں کی ملکیت متصور ہوتے تھے۔ چنانچہ اس نظریہ کے ماتحت کسی خاص علاقہ کا کسی دوسرے ملک کے ساتھ الحاق عمل میں آ سکتا تھا۔ اور ایسی صورت میں اس علاقہ کے باشندوں کی خواہشات کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ خواہ اُن میں اور اُن کے نئے بادشاہ کی رعایا میں بہ لحاظ مذہب نسل، زبان، اور تہذیب میں کس قدر ہی اختلاف کیوں نہ ہوتا۔ باشندے بھی اپنے آپ کو بادشاہ کی موروثی جائداد تصور کرتے ہوئے چون و چرا نہ کرتے تھے۔ اکثر ملک اور صوبے فروخت بھی ہو جاتے۔ لیکن صدی مذکورہ کے آغاز کے بعد بادشاہوں کے لئے اس قسم کی خودسرانہ کارروائیاں ناممکن ہو گئیں